مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

اسلام اور
جدید معیشت و تجارت

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

جملہ حقوقِ طباعت بحق مکتبہ معارف القرآن کراچی محفوظ ہیں

باہتمام : محمد مشتاق قاسمی

طبع جدید : جمادی الثانی ۱۴۳۷ھ - اپریل ۲۰۱۶ء

ناشر : مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

فون : 92-21-35031565, 35123130

ای میل : info@quranicpublishers.com
mm.q@live.com

ویب سائٹ : www.SHARIAH.com

ONLINE
www.SHARIAH.com
آن لائن خریداری کے لئے تشریف لائیں۔

ملنے کے پتے
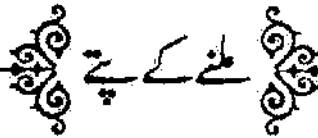
مکتبہ دار العلوم، کراچی
ادارۃ المعارف، کراچی
دار الاشاعت، کراچی
بیت القرآن، کراچی
بیت الکتب، کراچی
مکتبۃ القرآن، کراچی
ادارہ اسلامیات، کراچی / لاہور
بیت العلوم، لاہور
مکتبہ رحمانیہ، لاہور
مکتبہ سید احمد شہید، لاہور
مکتبہ رشیدیہ، کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ، راولپنڈی
مکتبہ اصلاح و تبلیغ، حیدر آباد
ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان

حرفِ آغاز

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

اما بعد: موجودہ دور میں وسیع پیمانے کی تجارت وصنعت نے معاملات کی نئی نئی صورتیں اور ان سے متعلق نئے نئے مسائل پیدا کئے ہیں، جن پر دُنیا بھر میں غور ہو رہا ہے، اور ان کے مختلف حل سامنے لائے جارہے ہیں۔ یہاں تک کہ تجارت و معیشت نے مستقل علوم کی حیثیت اِختیار کر لی ہے، جن کی تعلیم عصری درس گاہوں میں دی جارہی ہے۔

الحمدللہ، کچھ عرصے سے مسلمانوں میں یہ شعور پیدا ہونے لگا ہے کہ مغربی اِستعمار نے جو معاشی نظام عالمِ اسلام پر مسلط کیا ہے، اس کی خرابیوں سے نجات حاصل کر کے اپنی معاشی سرگرمیوں کو اِسلام کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ یہ فکر اِنفرادی اور اِجتماعی سطح پر عالمِ اسلام کے ہر حصے میں بفضلہٖ تعالیٰ فروغ پارہی ہے۔ اِنفرادی سطح پر وہ مسلمان تاجر اور صنعت کار جو دِین پر عمل کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں، اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اپنا کاروبار حتی الامکان اسلامی تعلیمات کی روشنی میں چلائیں، اور اِجتماعی سطح پر بھی یہ کوششیں مختلف ملکوں میں جاری ہیں کہ معیشت کو اِسلامی اَحکام کے تابع بنایا جائے۔

ان دونوں قسم کی کوششوں کو قرآن وسنت اور اِسلامی فقہ میں بصیرت رکھنے والے اہلِ علم کی رہنمائی کی شدید ضرورت ہے، لیکن مغربی اِستعمار کے دور میں علمائے کرام اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہوگئی ہے کہ دونوں

کے سوچنے کا انداز، دونوں کی زبان اور دونوں کی اِصطلاحات اتنی مختلف ہیں کہ ایک کو دُوسرے کی بات سمجھنے میں بھی دُشواری پیش آتی ہے، اس لئے ان مسائل پر باہمی گفتگو اور اِفادہ و اِستفادہ کی راہ میں شدید رُکاوٹیں پیدا ہوگئی ہیں۔

کم از کم معاشی مسائل کی حد تک اس خلیج کو دُور کرنے، دونوں طبقوں کو ایک دُوسرے کے قریب لانے اور دونوں کے درمیان افہام و تفہیم کا راستہ کھولنے کے لئے "مرکز الاقتصاد الاسلامی" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا ہے جس نے جامعہ دارالعلوم کراچی کے تعاون سے متعدّد تربیتی کورس منعقد کئے، کچھ تربیتی کورس تاجروں، صنعت کاروں، مالیاتی اداروں اور معیشت کے دُوسرے شعبوں سے متعلق افراد کے لئے منعقد کئے گئے جن میں انہیں تجارتی معاملات سے متعلق بنیادی اسلامی اَحکام سے روشناس کرایا گیا، یہ کورس اس لحاظ سے بفضلہٖ تعالیٰ انتہائی کامیاب رہے کہ ان میں معیشت کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد نے اِنتہائی دِلچسپی اور اِنہماک کے ساتھ شرکت کی، اور اپنے اپنے شعبے سے متعلق بنیادی اسلامی اَحکام سے آگاہ ہوئے، ان کورسوں کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔

دُوسری طرف کچھ کورس علمائے کرام اور خاص طور پر فتویٰ سے تعلق رکھنے والے حضرات کے لئے منعقد کئے گئے جن میں انہیں معیشت کے موجودہ تصوّرات اور عصرِ حاضر میں کاروبار کی مختلف صورتوں کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کی گئیں۔ مقصد یہ تھا کہ تجارت و معیشت کے جن مسائل کا براہِ راست تعلق فقہ سے ہے، ان کی موجودہ صورتِ حال وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ان کے علم میں آئے، تاکہ وہ اسے کماحقہٗ سمجھ کر اس کا فقہی حکم واضح کرسکیں۔

اس مقصد کے لئے انہیں پورا علمِ معاشیات یا پورا علمِ تجارت سکھانے کی ضرورت نہیں تھی، بلکہ ان دونوں کے صرف ان مباحث کا انتخاب پیشِ نظر تھا جو ان کی مذکورہ ضرورت کو پورا کرسکے۔ دُوسری طرف ان کے سامنے ان موضوعات کی تفہیم کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی شخص ان کے جانے پہچانے اُسلوب اور ان کی اپنی زبان میں ان مسائل کی وضاحت کرے۔

لہٰذا بعض ابتدائی تجربوں کے بعد احقر نے یہ فیصلہ کیا کہ اس درس کی ذمہ داری میں خود اُٹھاؤں، تاکہ مذکورہ ضرورتیں پوری ہوسکیں۔ لیکن چونکہ معیشت و تجارت میرا اختصاصی موضوع نہیں ہے، اس لئے میں نے اپنے دو محترم دوستوں سے درخواست کی کہ وہ احقر کی معاونت کے لئے درس کے دوران موجود رہیں، تاکہ اگر میں کہیں غلطی کروں تو اس کی اصلاح کردیں، اور بوقتِ ضرورت اضافی وضاحتیں بھی پیش کرسکیں۔

ان میں سے ایک جناب ڈاکٹر ارشد زمان صاحب تھے جو ہمارے ملک کے ممتاز ماہرینِ معاشیات میں سے ہیں، اور عرصۂ دراز تک ہماری وزارتِ خزانہ میں چیف اکنامسٹ کے منصب پر فائز رہے ہیں۔ وہ ماشاء اللہ پورے کورس میں --جو رجب ۱۴۱۳ھ میں تقریباً چار ہفتے جامعہ دارالعلوم کورنگی میں جاری رہا- بہ نفسِ نفیس موجود رہے، اور متعدد مواقع پر انہوں نے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ بالخصوص شرحِ مبادلہ کے مختلف نظاموں کے تعارف اور مالیاتِ عامہ کے موضوعات پر انہوں نے باقاعدہ لیکچر بھی دیئے۔

دُوسرے جناب سیّد محمد حسین صاحب تھے، جو ہمارے ملک کے ممتاز چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہیں، اور اس حوالے سے ملک بھر میں معروف ہیں، وہ آج کل انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس کے چیئرمین بھی ہیں، اور مرکز الاقتصاد الاسلامی کے وائس چیئرمین بھی۔ انہوں نے بھی کورس کے ایک بڑے حصے میں شرکت فرمائی، اور اپنی معلومات سے احقر کی اور حاضرین کی رہنمائی کی، خاص طور پر ''کمپنی کے حسابات'' کے موضوع پر باقاعدہ لیکچر دیا۔

ان دو حضرات کی موجودگی احقر کے لئے بہت تقویت اور ہمت افزائی کا باعث بنی، اور اس طرح یہ کورس بفضلہٖ تعالیٰ کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔

یہ کورس چونکہ ایک تجرباتی نوعیت کا تھا، اس لئے اسے دارالعلوم کے اساتذہ اور تخصص کے طلبہ کی حد تک ہی محدود رکھا گیا تھا۔ البتہ فیصل آباد سے مولانا مفتی محمد مجاہد صاحب نے بھی جو دارالعلوم کے تخصص فی الافتاء کے فاضل ہیں، اور آج کل مہ

جامعہ امدادیہ میں اُستاذِ حدیث اور مفتی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں، اس میں شرکت فرمائی، اور انہوں نے ہی اس پورے درس کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے تحریری شکل میں محفوظ کیا۔

چونکہ حاضرین نے اس کورس کی بہت افادیت محسوس کی، اس لئے اگلے سال یعنی جمادی الاولیٰ ۱۴۱۴ھ میں اسی قسم کے ایک اور کورس کا اہتمام کیا گیا، جس میں شرکت کے لئے ملک کے منتخب دینی اداروں کے اساتذہ اور مفتی حضرات کو بھی دعوت دی گئی، چنانچہ اس کورس میں شرکت کے لئے ڈیرہ اسماعیل خان سے لے کر کراچی تک کے ممتاز دینی اداروں کے اساتذۂ کرام، مفتی حضرات اور اہلِ علم دارالعلوم کورنگی میں تشریف لائے، باہر سے تشریف لانے والوں کی تعداد پچاس تھی، ان کی سہولت کے لئے درس کا روزانہ دورانیہ بڑھا کر کورس کو دو ہفتوں میں سمیٹا گیا۔ اور اس مرتبہ بھی یہ خدمت احقر نے انجام دی۔ درس کے اختتام پر امتحان بھی ہوا اور ''مرکز الاقتصاد الاسلامی'' کی طرف سے اس کی سند بھی جاری کی گئی۔

اس دُوسرے کورس کے موقع پر احقر کو پچھلے تجربے اور نئے حالات کی روشنی میں درس کے موضوعات اور مضامین میں حذف و اضافہ کا بھی موقع ملا، اور اس طرح یہ دُوسرا دورہ بحمداللہ پہلے سے زیادہ کامیاب اور مفید رہا۔

احباب کی طرف سے ضرورت محسوس کی گئی کہ اس درس کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے، تاکہ وہ حضرات بھی اس سے متعارف ہوسکیں جو کورس میں شریک نہیں ہوسکے، نیز یہ تقاریر ایک مستقل افادیت کی حامل ہوسکیں۔ احقر اپنی مصروفیات کی بناء پر ان تمام تقاریر کو ضبطِ تحریر میں لانے سے قاصر تھا، لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ مولانا مفتی محمد مجاہد صاحب نے ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے جو تحریر تیار کی ہے، اسے شائع کردیا جائے۔ چنانچہ جو کتاب اس وقت آپ کے سامنے ہے، بنیادی طور پر یہ وہی تحریر ہے، البتہ احقر نے اس پر نظرِ ثانی کرکے مناسب ترمیم و اضافہ کیا ہے۔ اور اَب اسے اللہ تعالیٰ کے نام پر شائع کیا جارہا ہے، لیکن اس تحریر کے بارے میں مندرجہ ذیل اُمور ذہن میں رکھنے ضروری ہیں:-

۱- یہ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں ہے، بلکہ سلسلہ وار تقاریر کا مجموعہ ہے، مولانا مفتی محمد مجاہد صاحب نے یہ تقاریر لفظ بہ لفظ مرتب نہیں کیں، بلکہ تقاریر کا خلاصہ اور مغز اپنے الفاظ میں مرتب کیا ہے، لہٰذا اندازِ بیان میں اِختصار ملحوظ رہا ہے۔ اور فاضل مرتب نے طویل بحثوں کو مختصر اَلفاظ اور تعبیرات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے، اس لئے عام قاری بعض جگہ شاید تنگلک محسوس کرے، لیکن اُمید ہے کہ اہلِ علم اسے قدرے توجہ سے پڑھیں گے تو اِن شاء اللہ سمجھنے میں دُشواری نہیں ہوگی۔

۲- ان تقاریر کے براہِ راست مخاطب علمائے کرام تھے، اس لئے خاص طور پر فقہی بحثوں میں فقہی اِصطلاحات بکثرت استعمال ہوئی ہیں، اور مضامین کا انتخاب بھی انہی کی ضرورت کے مطابق کیا گیا ہے۔

۳- اگرچہ اس درس کا بنیادی مقصد موجودہ معیشت اور تجارت وصنعت کے اہم اجزاء کا تعارف تھا، تاکہ علمائے کرام کے لئے ان مسائل پر غور وفکر اور تحقیق آسان ہوجائے، لیکن چونکہ پچھلے تقریباً دس بارہ سال سے یہ مسائل خود احقر کے غور و تحقیق کا موضوع رہے ہیں، اس لئے شرکائے درس کی خواہش تھی کہ میں ان مسائل کے بارے میں اپنی سوچ کا خلاصہ بھی ان کی خدمت میں پیش کروں، اس لئے ان مسائل پر احقر نے فقہی حیثیت سے بھی گفتگو کی ہے۔

اس گفتگو کے بارے میں احقر نے شرکائے درس پر یہ بات واضح کردی تھی کہ اس کی حیثیت محض ایک سوچ کی ہے، اور اسے اس لئے پیش کیا جارہا ہے کہ اہلِ علم اس پر غور فرماسکیں۔ ان میں سے بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا صریح حکم کتاب وسنت یا فقہ میں موجود نہیں ہے، اس لئے ان میں اِجتماعی غور وتحقیق و اِستنباط کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ان تقاریر میں کسی بھی مسئلے سے متعلق جو فقہی گفتگو کی گئی ہے، وہ اس موضوع پر حرفِ آخر نہیں ہے، یہ مسائل اس لئے چھیڑے گئے ہیں تاکہ ان پر بحث ونظر کا دروازہ کھلے، احقر کی یہ سوچ احقر کے ذاتی رُجحان اور میلان کی آئینہ دار ضرور ہے، لیکن اسے ہر مسئلے میں احقر کی طرف سے حتمی فتویٰ بھی سمجھنا نہیں چاہئے۔

ان اُمور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے گا تو اُمید ہے

کہ ان شاء اللہ یہ کتاب فائدے اور دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ اگر اہلِ علم حضرات اسے پڑھ کر ان مسائل پر۔ جو اس وقت پورے عالمِ اسلام کو درپیش ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کی رہنمائی کی طرف متوجہ ہوگئے تو میں سمجھوں گا کہ بفضلہٖ تعالیٰ یہ محنت ٹھکانے لگی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین کی صحیح فہم عطا فرمائیں، اور اس پر عمل کرنے اور رُوئے زمین پر اسے عملاً قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

محمد تقی عثمانی
جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴
۲۱ رذیقعدہ ۱۴۱۴ھ

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

مضمون	صفحہ نمبر

کاغذی نوٹ کی حیثیت اور اس کے فقہی اَحکام

قدرِ زَر، اِفراط و تفریطِ زَر اور قیمتوں کا اِشاریہ

بینکاری (Banking)

مرکزی بینک "البنک الرئیسی" (Central Bank)

مضمون	صفحہ نمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ
الۡکَرِیۡمِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

مضمون کا تعارف اور اس کی ضرورت

اس درس کا مقصد یہ ہے کہ جدید معاملات جس طریقے سے آج دُنیا میں رائج ہیں، اس کی کم از کم اِجمالی واقفیت طلبہ کو حاصل ہوجائے تاکہ ان معاملات کی حقیقت سمجھنے کے بعد ان کے بارے میں شرعی اَحکام کی تحقیق کی جاسکے، آپ حضرات کو معلوم ہی ہے کہ فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ:-

من جهل بأهل زمانه فهو جاهل.

(شرح عقود رسم المفتی ص:۹۸)

ترجمہ:- جو آدمی اپنے اہلِ زمانہ سے واقف نہ ہو (یعنی اہلِ زمانہ کے طرزِ زندگی، ان کی معاشرت، ان کے معاشی معاملات اور ان کے مزاج و مذاق سے واقف نہ ہو) تو وہ جاہل ہے۔

ایک عالم کے لئے جس طرح قرآن و سنت کے اَحکام سے واقف ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس کے لئے زمانے کے ''عرف'' اور زمانے کے حالات سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، اس کے بغیر وہ شرعی مسائل میں صحیح نتائج تک نہیں پہنچ

سکتا۔ حضرت امام محمد بن الحسن شیبانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں یہ بات وضاحت کے ساتھ ملتی ہے کہ فقہ کی تدوین کے دوران وہ باقاعدہ بازاروں میں جاکر تاجروں کے پاس بیٹھنے، اور ان کے معاملات کو سمجھتے تھے اور یہ دیکھا کرتے تھے کہ کونسے طریقے بازار میں رائج ہیں، ظاہر ہے کہ ان کا مقصد خود تجارت کرنا نہیں تھا، وہ صرف یہ جاننے کے لئے ان تاجروں کے پاس بیٹھتے تھے کہ ان کے کیا طریقے ہیں اور ان کے درمیان آپس میں کیا عرف رائج ہے؟ اس لئے کہ ان چیزوں سے واقفیت ایک عالم اور بالخصوص ایک فقیہ اور مفتی کے فرائض میں داخل ہے کہ جب اس کے بارے میں اس کے پاس سوال آئے تو وہ اس سوال کے پس منظر سے اچھی طرح واقف ہو، اس کے بغیر وہ صحیح نتائج تک نہیں پہنچ سکتا ــــــ بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جب کسی علاقے یا کسی معاشرے میں ناجائز کاروبار کی کثرت ہو تو چونکہ عالم اور مفتی صرف فتویٰ جاری کرنے والا نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک داعی بھی ہوتا ہے، اس لئے اس کا کام اس حد پر جاکر ختم نہیں ہوجاتا کہ وہ صرف اتنا کہہ دے کہ فلاں کام ناجائز اور حرام ہے، بلکہ بحیثیتِ داعی اس کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کام کو ناجائز اور حرام کہنے کے بعد یہ بھی بتائے کہ اس کا متبادل حلال طریقہ کیا ہے؟ وہ متبادل قابلِ عمل بھی ہونا چاہئے اور شریعت کے اَحکام کے مطابق بھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآنِ کریم میں مذکور ہے کہ جب ان کے پاس قیدخانے میں بادشاہ کا پیغام پہنچا اور خواب کی تعبیر ان سے پوچھی گئی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیر تو بعد میں بتلائی کہ سات سال کا قحط آنے والا ہے لیکن اس قحط سے نجات حاصل کرنے کا راستہ پہلے بتادیا، چنانچہ فرمایا کہ:۔

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖۤ اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ

اس آیت سے یہ استنباط کیا گیا ہے کہ داعیِ حق صرف عام کام کو حرام کہہ دینے پر اکتفا نہ کرے یا صرف کسی مصیبت کا بیان کرنے پر اکتفا کرے کہ یہ مصیبت آنے والی ہے بلکہ اپنے اِمکان کی حد تک اس سے نکلنے کا راستہ بھی بتائے، اور یہ راستہ اسی وقت بتایا جاسکتا ہے جب آدمی معاملات اور حقائق سے واقف ہو، اسی

بات کے پیشِ نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ معاملاتِ جدیدہ کے متعلق ایک درس تخصص کے نصاب میں شامل ہو۔ معاشیات آج کل ایک مستقل فن بن چکا ہے اور اس کے متخصص ماہرین ہوتے ہیں، اس وقت فنِ معاشیات کو بتمام و کمال پڑھانا پیشِ نظر نہیں ہے، بلکہ اس کے ان حصوں سے آپ کو متعارف کرانا ہے جن کی ضرورت ایک عالم اور فقیہ کو بحیثیتِ فقیہ پیش آتی ہے، اور جن کے بارے میں بکثرت سوالات بھی آتے ہیں اور ان کا جواب تلاش کرنا ہوتا ہے۔ عموماً ماہرینِ معاشیات ایک عالم کی ان ضروریات سے واقف نہیں ہوتے جن کی عالم کو تحقیقِ مسائل میں ضرورت پیش آتی ہے اس لئے میں نے خود ہی اس درس کا اہتمام کیا۔

نظامہائے معیشت اور ان پر تبصرہ

دُنیا میں اس وقت جو مختلف معاشی نظام رائج ہیں ان میں دو نظام سب سے زیادہ نمایاں ہیں، ایک سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) جس کو عربی میں "الراسمالیة" کہتے ہیں، اور دُوسرا اِشتراکی نظام (Socialism) جس کو عربی میں "الاشتراکیة" کہتے ہیں، اسی کی انتہائی صورت اشتمالیت (Communism) ہے جسے عربی میں "الشیوعیة" کہا جاتا ہے۔ دُنیا میں جو کچھ کاروبار یا معاملات ہو رہے ہیں وہ انہی دو نظاموں کے ماتحت ہو رہے ہیں، سوویت یونین کے زوال کے بعد اگرچہ سوشلزم ایک سیاسی طاقت کی حیثیت سے تو ختم ہو چکا، اور اس کے ساتھ ہی اس نظریے کی طاقت بھی کمزور پڑگئی ہے، لیکن ایک معاشی نظریے کے اعتبار سے وہ دُنیا کے معاشی نظریات میں اب بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے اس لئے اس کو سمجھنا بھی ضروری ہے، لہٰذا سب سے پہلے ان دو معاشی نظاموں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے اور پھر ان کے مقابلے میں اسلام کے وجوہِ امتیاز کو بیان کیا جائے گا۔

بنیادی معاشی مسائل

سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ معیشت کیا ہوتی ہے؟ اور اس کے بنیادی مسائل کیا ہوتے ہیں؟ آج جس کو ہم اُردو میں "معاشیات" کہتے ہیں وہ درحقیقت انگریزی کے لفظ "اکنامکس" (Economics) کا ترجمہ ہے، اور دراصل "اکنامکس" کا صحیح ترجمہ "معاشیات" نہیں ہے، بلکہ اس کا صحیح ترجمہ وہ ہے جو عربی میں لفظ "اِقتصاد" سے کیا جاتا ہے، اور اسی لفظ سے یہ بات نکل رہی ہے کہ یہ مفروضہ تمام معاشی افکار میں تسلیم کیا گیا ہے کہ "انسانی ضروریات اور خواہشات انسانی وسائل

کے مقابلے میں زیادہ ہیں" اور "ضروریات" کا لفظ جب موجودہ معیشت میں استعمال ہوتا ہے تو اس میں خواہشات بھی داخل ہوتی ہیں۔ غرض انسانی وسائل محدود ہیں اور اس کے مقابلے میں ضروریات اور خواہشات بہت زیادہ ہیں۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان لامحدود ضروریات اور خواہشات کو محدود وسائل کے ذریعے کس طرح پورا کیا جائے؟

"اِقتصاد" اور "اکنامکس" کے یہی معنی ہیں کہ ان وسائل کو اس طریقے سے استعمال کیا جائے کہ ان کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ضرورتیں پوری ہوسکیں، اس وجہ سے اس علم کو "اکنامکس" اور "اِقتصاد" کہتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے ہر معیشت میں کچھ بنیادی مسائل ہوتے ہیں جن کو حل کئے بغیر وہ معیشت نہیں چل سکتی، عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بنیادی مسائل چار ہوتے ہیں۔

۱- ترجیحات کا تعین (Determination of Priorities)

پہلا مسئلہ جس کو معیشت کی اِصطلاح میں "ترجیحات کا تعین" کہا جاتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کی ضروریات اور خواہشات بے شمار ہیں، اور ان کے مقابلے میں وسائل محدود ہیں، ظاہر ہے کہ ان محدود وسائل کے ذریعے تمام ضروریات اور خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں لہٰذا کچھ ضروریات اور خواہشات کو مقدم کرنا پڑے گا اور کچھ کو مؤخر کرنا پڑے گا۔ لیکن کونسی ضرورت کو مقدم کیا جائے اور کونسی ضرورت کو مؤخر کیا جائے؟ مثلاً میرے پاس پچاس روپے ہیں، ان پچاس روپے سے آٹا بھی خرید سکتا ہوں، کپڑا بھی خرید سکتا ہوں، کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ریفریشمنٹ کھانے پر بھی خرچ کرسکتا ہوں، یہ چار پانچ اختیارات (Options) میرے سامنے ہیں، اب میں یہ پچاس روپے ان میں سے کس کام پر خرچ کروں؟ اس کو "ترجیحات کا تعین" کہا جاتا ہے۔

یہ مسئلہ جس طرح ایک انسان کو پیش آتا ہے اسی طرح پورے ملک اور پوری ریاست کو بھی پیش آتا ہے مثلاً پاکستان کے کچھ قدرتی وسائل ہیں، کچھ انسانی وسائل ہیں،

کچھ معدنی وسائل ہیں، کچھ نقد وسائل ہیں، یہ سارے وسائل محدود ہیں اور اس کے مقابلے میں ضروریات اور خواہشات لامتناہی ہیں۔ اب یہ متعین کرنا پڑے گا کہ ان وسائل کو کس کام میں صرف کیا جائے؟ اور کس چیز کی پیداوار کو ترجیح دی جائے؟ اس مسئلے کا نام ''ترجیحات کا تعین'' ہے۔

۲- وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources)

دُوسرا مسئلہ ہے ''وسائل کی تخصیص'' ہمارے پاس وسائلِ پیداوار ہیں یعنی سرمایہ، محنت، زمین، ان کو ہم کن کاموں میں کس مقدار میں لگائیں؟ مثلاً ہماری زمینیں ہیں، اب کتنی زمین پر ہم گندم کاشت کریں؟ کتنی زمین پر چاول کاشت کریں؟ اور کتنی زمین پر روئی کی کاشت کریں؟ یا اسی طرح ہمارے پاس کارخانے لگانے کی صلاحیت ہے جس سے ہم کپڑا بھی بناسکتے ہیں، جوتے بھی بناسکتے ہیں اور کھانے پینے کی اشیاء بھی بناسکتے ہیں، اب کتنے کارخانوں کو کپڑا بنانے میں استعمال کریں؟ اور کتنے کارخانوں کو جوتے بنانے میں لگائیں؟ اور کتنے کارخانوں کو کھانے پینے کی اشیاء میں استعمال کریں؟ اس سوال کے تعین کو معیشت کی اصطلاح میں ''وسائل کی تخصیص'' کہا جاتا ہے۔

۳- آمدنی کی تقسیم (Distribution of Income)

تیسرا مسئلہ ہے ''آمدنی یا پیداوار کی تقسیم'' یعنی مندرجہ بالا وسائل کو کام میں لگانے کے بعد اس کے نتیجے میں جو پیداوار یا جو آمدنی حاصل ہوئی اس کو کس طرح معاشرے میں تقسیم کیا جائے؟ اور کس بنیاد پر تقسیم کیا جائے؟ اس کو معاشیات کی اصطلاح میں ''آمدنی کی تقسیم'' کہا جاتا ہے۔

۴- ترقی (Development)

چوتھا مسئلہ ہے ''ترقی'' یعنی اپنی معاشی حاصلات کو کس طرح ترقی دی جائے؟ تاکہ جو پیداوار حاصل ہورہی ہے وہ معیار کے لحاظ سے پہلے سے زیادہ اچھی ہو، اور مقدار کے اعتبار سے اس میں اضافہ ہو، اور کس طرح نئی نئی ایجادات اور

مصنوعات وجود میں لائی جائیں تاکہ معاشرہ ترقی کرے اور لوگوں کے پاس اسباب معیشت میں اضافہ ہو اور لوگوں کو آمدنی کے ذرائع مہیا ہوں۔ اس مسئلے کو معاشیات کی اصطلاح میں ''ترقی'' کہا جاتا ہے۔

یہ چار بنیادی مسائل ہیں جنھیں حل کرنا ہر معاشی نظام کے لئے ضروری ہے، یعنی ترجیحات کا تعین، وسائل کی تخصیص، آمدنی کی تقسیم اور ترقی۔ پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مسائل اگرچہ فطری مسائل ہیں، لیکن ایک نظام کے تحت ان کو سوچنے، ان کا حل تلاش کرنے کی فکر آخری صدیوں میں زیادہ ہوئی اور اس کے نتیجے میں دو متقابل نظریات ہمارے سامنے آئے، ایک سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) اور دُوسرا اشتراکی نظام (Socialism)۔

سرمایہ دارانہ نظام

(Capitalism)

سب سے پہلے سرمایہ دارانہ نظام کے بارے میں سمجھئے کہ اس نے ان چار مسائل کو کن بنیادوں پر حل کرنے کا دعویٰ کیا ہے؟ اور ان کو حل کرنے کے لئے کیا فلسفہ پیش کیا ہے؟

سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ ان چاروں مسائل کو حل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ہر انسان کو **تجارتی اور صنعتی سرگرمیوں کے لئے بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے،** اور اسے یہ چھوٹ دے دی جائے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے **جو طریقہ مناسب سمجھے اختیار کرے۔** اس سے معیشت کے مذکورہ بالا چاروں مسائل آپ ہی آپ حل ہوتے چلے جائیں گے، کیونکہ جب ہر شخص کی فکر یہ ہوگی کہ میں زیادہ سے زیادہ نفع کماؤں تو ہر شخص معیشت کے میدان میں وہی کام کرے گا جس کی معاشرے کو ضرورت ہے، اور اس کے نتیجے میں چاروں مسائل خود بخود ایک خاص توازن کے ساتھ طے ہوتے چلے جائیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ چاروں مسائل خود بخود کس طرح حل ہوں گے؟ اس سوال کے جواب کے لئے تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل کے لئے مندرجہ ذیل نکات قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ درحقیقت اس کائنات میں بہت سے قدرتی قوانین کارفرما ہیں، جو ہمیشہ ایک جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں، انہی میں سے ایک قانون رسد (Supply) اور طلب (Demand) کا بھی ہے۔ رسد کسی بھی سامانِ تجارت کی اس مجموعی مقدار سے عبارت ہے جو بازار میں فروخت کے لئے لائی گئی ہو اور طلب خریداروں کی اس خواہش کا نام ہے کہ وہ یہ سامانِ تجارت قیمتاً بازار سے خریدیں۔ اب رسد وطلب کا قدرتی قانون یہ

ہے کہ بازار میں جس چیز کی رسد طلب کے مقابلے میں زیادہ ہو، اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے، اور جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں بڑھ جائے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً گرمی کے موسم میں جب گرمی زیادہ پڑنے لگے تو بازار میں برف کے خریدار زیادہ ہوجاتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ برف کی طلب بڑھ گئی، اب اگر برف کی مجموعی پیداوار یا بازار میں پائی جانے والی برف کی مجموعی مقدار اس طلب کے مقابلے میں کم ہو، تو یقیناً برف کی قیمت بڑھ جائے گی۔ اِلّا یہ کہ اس وقت برف کی پیداوار میں اتنا ہی اضافہ ہوجائے جتنا طلب میں اضافہ ہوا ہے تو پھر قیمت نہیں بڑھے گی۔ دُوسری طرف سردی کے موسم میں برف کے خریدار کم ہوجاتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ برف کی طلب گھٹ گئی۔ اب اگر بازار میں برف کی مجموعی مقدار اس طلب کے مقابلے میں زیادہ ہو تو یقیناً برف کی قیمت میں کمی آجائے گی۔ یہ ایک قدرتی قانون ہے، جس کو قانونِ رسد وطلب (Law of Demand and Supply) کہا جاتا ہے۔

۲- سرمایہ دارانہ نظام کا فلسفہ یہ کہتا ہے کہ رسد وطلب کا یہ قدرتی قانون ہی درحقیقت زراعت پیشہ افراد کے لئے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ اپنی زمینوں میں کیا چیز اُگائیں؟ اور یہی قانون صنعت کاروں اور تاجروں کے لئے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ کیا چیز کتنی مقدار میں بازار میں لائیں؟ اور اس طرح معیشت کے چاروں مذکورہ بالا مسائل خودبخود طے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

۳- طلب ورسد کے قانون سے ترجیحات کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے آزاد چھوڑ دیا تو ہر شخص اپنے منافع کے خاطر وہی چیز بازار میں لانے کی کوشش کرے گا، جس کی ضرورت یا طلب زیادہ ہوگی، تاکہ اسے اس کی زیادہ قیمت مل سکے۔ زراعت پیشہ افراد وہی چیزیں اُگانے کو ترجیح دیں گے جن کی بازار میں طلب زیادہ ہے اور صنعت کار وہی مصنوعات تیار کرنے کی کوشش کریں گے جن کی بازار میں زیادہ مانگ ہے، کیونکہ اگر یہ لوگ ایسی چیزیں بازار میں لائیں، جن کی طلب کم ہے، تو انہیں زیادہ منافع نہیں مل سکے گا۔ اس

کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اگرچہ اپنے منافع کے خاطر کام کر رہا ہے، لیکن رسد و طلب کی قدرتی طاقتیں اسے مجبور کر رہی ہیں کہ وہ معاشرے کی طلب اور ضرورت کو پورا کرے۔ یہاں تک کہ جب کسی چیز کی پیداوار بازار میں اتنی آجائے کہ وہ اس کی طلب کے برابر ہو جائے تو اب اسی چیز کا مزید پیدا کرنا چونکہ تاجر اور صنعت کار کے لئے نفع بخش نہیں ہوگا، اس لئے اب وہ اس کی پیداوار بند کر دے گا۔ اس طرح معاشرے میں صرف وہی چیزیں پیدا ہوں گی جن کی معاشرے کو ضرورت ہے، اور اتنی ہی مقدار میں پیدا ہوں گی جتنی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے واقعتا درکار ہے، اور اسی کا نام ترجیحات کا تعین ہے۔

وسائل کی تخصیص (Allocation of Resources)

۴- اس کا تعلق بھی درحقیقت ترجیحات کے تعین ہی سے ہے، جب کوئی شخص ترجیحات کا باقاعدہ تعین کرلیتا ہے تو اسی حساب سے موجودہ وسائل کو مختلف کاموں میں لگاتا ہے، لہٰذا رسد و طلب کے قوانین جس طرح ترجیحات کا تعین کرتے ہیں، اسی طرح وسائل کی تخصیص کا کام بھی ساتھ ساتھ انجام دیتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہر شخص اپنے وسائل یعنی زمین، سرمایہ اور محنت کو اسی کام میں لگاتا ہے تاکہ وہ ایسی چیزیں بازار میں لاسکے جن کی بازار میں طلب زیادہ ہے اور اسے منافع زیادہ حاصل ہو۔ لہٰذا رسد و طلب کے قوانین کے ذریعے وسائل کی تخصیص کا مسئلہ بھی خود بخود طے ہوجاتا ہے۔

۵- تیسرا مسئلہ آمدنی کی تقسیم کا ہے، یعنی عملِ پیدائش کے نتیجے میں جو پیداوار یا آمدنی حاصل ہوئی، اسے معاشرے میں کس بنیاد پر تقسیم کیا جائے؟ سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ جو کچھ آمدنی حاصل ہو وہ انہی عوامل کے درمیان تقسیم ہونی چاہئے جنھوں نے پیدائش کے عمل میں حصہ لیا۔ سرمایہ دارانہ فلسفے کے مطابق یہ عوامل کل چار ہیں:-

۱- زمین ۲- محنت ۳- سرمایہ ۴- آجر یا تنظیم

آجر یا تنظیم سے مراد وہ شخص ہے جو اِبتداءً کسی عملِ پیدائش کا ارادہ کر کے پہلے تین عوامل کو اس کام کے لئے اِکھٹا کرتا ہے اور نفع نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کا کہنا یہ ہے کہ عملِ پیدائش کے نتیجے میں جو کچھ آمدنی ہو وہ اس طرح تقسیم ہونی چاہئے کہ زمین مہیا کرنے والے کو کرایہ دیا جائے، محنت کرنے والے کو اُجرت دی جائے، سرمایہ فراہم کرنے والے کو سود دیا جائے، اور وہ آجر جو اس عملِ پیدائش کا اصل محرک تھا، اسے منافع دیا جائے۔ یعنی زمین کا کرایہ، محنت کی اُجرت اور سرمائے کا سود ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچے وہ آجر کا منافع ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ تعین کس طرح ہو کہ زمین کو کتنا کرایہ دیا جائے گا؟ محنت کو کتنی اُجرت دی جائے گی؟ اور سرمائے کو کتنا سود دیا جائے گا؟ اس سوال کے جواب میں سرمایہ دارانہ فلسفہ پھر اس قانونِ رسد و طلب کو پیش کرتا ہے، یعنی یہ کہتا ہے کہ ان تینوں عوامل کے معاوضے کا تعین ان کی طلب و رسد ہی کی بنیاد پر ہوتا ہے، ان عوامل میں سے جس عامل کی طلب زیادہ ہوگی اس کا معاوضہ بھی اتنا زیادہ ہوگا۔

فرض کیجئے کہ زید ایک کپڑے کا کارخانہ لگانا چاہتا ہے، چونکہ وہ اس صنعت کے قائم کرنے کا محرک ہے اور وہی نفع نقصان کا خطرہ مول لے کر عواملِ پیداوار کو اکٹھا کرنے کا ذمہ دار ہے، اس لئے معاشی اِصطلاح میں اس کو "آجر" (Enterpreneur) کہا جاتا ہے۔ اب اسے کارخانہ لگانے کے لئے پہلے تو زمین کی ضرورت ہے، اگر زمین اس کے پاس نہیں ہے تو اسے کہیں سے کرایہ پر لینی پڑے گی، اب اس کرایہ کا تعین زمین کی رسد و طلب کی بنیاد پر ہوگا، یعنی اگر زمین کرایہ پر دینے والے بہت سے ہیں یعنی زمین کی رسد زیادہ ہے اور لینے والے اس کے مقابلے میں کم ہیں، یعنی طلب کم ہے، تو زمین کا کرایہ سستا ہوگا اور اگر اس کے برعکس صورت ہو تو زمین کا کرایہ مہنگا ہوگا۔ اس طرح رسد و طلب کے قوانین کرایہ کا تعین کریں گے۔

پھر اسے کارخانے میں کام کرنے کے لئے مزدور درکار ہوں گے، جن کو معاشی اِصطلاح میں محنت سے تعبیر کیا جاتا ہے، انہیں اُجرت دینی پڑے گی، اس اُجرت کا تعین بھی رسد و طلب کی بنیاد پر ہوگا، یعنی اگر بہت سے مزدور کام کرنے کے

لئے تیار ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ محنت کی رسد زیادہ ہے، لہٰذا اس کی اُجرت کم ہوگی۔ لیکن اگر اس کارخانے میں کام کرنے کے لئے زیادہ مزدور مہیا نہیں ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی رسد کم ہے، لہٰذا انہیں زیادہ اُجرت دینی پڑے گی۔ اس طرح اُجرت باہمی گفت و شنید کے نتیجے میں اس مقام پر متعین ہوگی، جس پر رسد و طلب دونوں کا اتفاق ہو۔

اسی طرح کارخانہ لگانے والے کو مشینری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوگی، جس پر سرمایہ دارانہ نظام میں اسے سود دینا پڑے گا، اس سود کی مقدار بھی رسد و طلب کی بنیاد پر طے ہوگی۔ اگر قرض دینے والے بہت سے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمائے کی رسد زیادہ ہے لہٰذا کم شرحِ سود پر کام چل جائے گا، لیکن اگر سرمایہ دار کو قرض دینے والے کم ہیں تو زیادہ شرحِ سود ادا کرنی پڑے گی۔ اس طرح شرحِ سود کا تعین بھی رسد و طلب کی بنیاد پر ہوگا، اور جب رسد و طلب کی مذکورہ بنیادوں پر کرایہ، اُجرت اور سود کا تعین ہوگیا تو کارخانے کی پیداوار کے نتیجے میں جو آمدنی ہوگی، اس کا باقی ماندہ حصہ آجر کو نفع کے طور پر ملے گا۔

اس طرح آپ نے دیکھا کہ آمدنی کی تقسیم کا بنیادی مسئلہ بھی سرمایہ دارانہ نظام میں رسد و طلب کے قوانین کے تحت انجام پاتا ہے۔

۶- چوتھا معاشی مسئلہ ترقی کا ہے، یعنی ہر معیشت کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیداوار کو ترقی دے اور اپنی پیداوار میں کمًا اور کیفًا اضافہ کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے کے مطابق یہ مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوتا ہے کہ ہر شخص کو جب زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے آزاد چھوڑا جائے گا تو رسد و طلب کے قدرتی قوانین اسے خود بخود اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ نئی سے نئی چیزیں اور بہتر سے بہتر کوالٹی بازار میں لائے، تاکہ اس کی مصنوعات کی طلب زیادہ ہو اور اسے زیادہ نفع حاصل ہو۔

***

سرمایہ دارانہ نظام کے اُصول

سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اُصول تین ہیں:-

۱- ذاتی ملکیت (Private Property)

پہلا اُصول یہ ہے کہ اس نظام میں ہر انسان کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ذاتی ملکیت میں اشیاء بھی رکھ سکتا ہے اور وسائلِ پیداوار بھی رکھ سکتا ہے۔ اشتراکی نظام میں اگرچہ ذاتی استعمال کی اشیاء تو ذاتی ملکیت میں آسکتی ہیں لیکن وسائلِ پیداوار مثلاً زمین یا کارخانہ عموماً ذاتی ملکیت میں نہیں ہوتے، البتہ سرمایہ دارانہ نظام میں ہر قسم کی چیز چاہے وہ استعمالی اشیاء سے تعلق رکھتی ہو یا اشیائے پیداوار میں سے ہو وہ ذاتی ملکیت میں آسکتی ہے۔

۲- ذاتی منافع کا محرک (Profit Motive)

دُوسرا اُصول یہ ہے کہ پیداوار کے عمل میں جو محرک کارفرما ہوتا ہے وہ انسان کے ذاتی منافع کے حصول کا محرک ہوتا ہے۔

۳- حکومت کی عدم مداخلت (Laissez Faire)

سرمایہ دارانہ نظام کا تیسرا اُصول یہ ہے کہ حکومت کو تاجروں کی تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے، وہ جس طرح کام کر رہے ہیں ان کی معاشی سرگرمی میں رُکاوٹ نہ ڈالنی چاہئے، نہ ان پر حکومت کی طرف سے زیادہ پابندیاں عائد کرنی چاہئیں۔ عام طور پر اس اُصول کے لئے "Laissez Faire" کی اِصطلاح استعمال ہوتی ہے، اصل میں یہ فرانسیسی لفظ ہے یعنی ''حکومت کی عدم مداخلت کی پالیسی'' اور اس کے معنی ہیں ''کرنے دو'' یعنی حکومت سے یہ کہا جارہا ہے کہ جو لوگ

اپنی معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ جس طرح بھی کام کر رہے ہیں ان کو کرنے دو، اس میں کوئی رُکاوٹ نہ ڈالو۔ اور حکومت کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ فلاں کام کرو، فلاں کام نہ کرو، اور نہ یہ حق ہے کہ وہ یہ کہے کہ اس طرح تجارت کرو، اس طرح نہ کرو۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا تیسرا اُصول ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کا اصل بنیادی فلسفہ یہی ہے۔

اگرچہ بعد میں خود سرمایہ دارانہ ممالک میں رفتہ رفتہ اس پالیسی کو محدود کر دیا گیا اور عملاً ایسا نہیں ہوا کہ حکومت بالکل مداخلت نہ کرے، بلکہ حکومت کی طرف سے بہت سی پابندیاں سرمایہ دارانہ ممالک میں نظر آئیں گی، مثلاً کبھی ٹیکسوں کے ذریعے بہت سی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں، یا کسی کام کی ہمت افزائی کے لئے حکومت بہت سے اقدامات کرتی ہے۔ آج پوری دُنیا میں کوئی ملک ایسا موجود نہیں ہے جس میں تجارت کے اندر حکومت کی بالکل مداخلت موجود نہ ہو، لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کا بنیادی فلسفہ یہی تھا کہ حکومت مداخلت نہ کرے، بلکہ تاجروں کو کھلی چھٹی دیدے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر یہ کہا جاتا رہا ہے کہ ''سب سے اچھی حکومت وہ ہے جو کم حکومت کرے''، یعنی مداخلت نہ کرے۔

چونکہ سرمایہ دارانہ معیشت میں ذاتی منافع کا محرک کارفرما ہوتا ہے اس لئے اس کو ''سرمایہ دارانہ نظام'' کہتے ہیں اور اس کا دُوسرا نام ''مارکیٹ اکانومی'' (Market Economy) یعنی بازار پر مبنی معیشت، اس لئے اس میں مارکیٹ کی قوتوں (Market Forces) یعنی رسد اور طلب سے کام لیا جاتا ہے۔

اِشتراکیت

(Socialism)

اِشتراکیت درحقیقت سرمایہ دارانہ نظام کے رَدِّعمل کے طور پر وجود میں آئی۔ سرمایہ دارانہ فلسفے کا پورا زور چونکہ اس بات پر تھا کہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے لئے ہر شخص آزاد ہے، اور معیشت کا ہر مسئلہ بنیادی طور پر صرف رسد وطلب کی بنیاد پر طے ہوتا ہے، اس لئے اس فلسفے میں فلاحِ عامہ اور غریبوں کی بہبود وغیرہ کا کوئی واضح اہتمام نہیں تھا، اور زیادہ منافع کمانے کی دوڑ میں کمزور اَفراد کے پسنے کے واقعات بکثرت پیش آئے، جس کے نتیجے میں غریب اور اُمیر کے درمیان فاصلے بہت زیادہ بڑھ گئے۔ اس لئے اِشتراکیت ان خرابیوں کے سدِّ باب کا دعویٰ لے کر میدان میں آئی، اور اس نے سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی فلسفے کو چیلنج کرتے ہوئے یہ ماننے سے انکار کیا کہ معیشت کے مذکورہ بالا چار بنیادی مسائل محض ذاتی منافع کے محرک، شخصی ملکیت اور بازار کی قوتوں کی بنیاد پر حل کئے جاسکتے ہیں۔

اِشتراکیت نے کہا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں معیشت کے تمام بنیادی مسائل کو رسد وطلب کی اندھی بہری طاقتوں کے حوالے کردیا گیا ہے، جو خالصتاً ذاتی منافع کے محرک کے طور پر کام کرتی ہیں اور ان کو فلاحِ عامہ کے مسائل کا ادارک نہیں ہوتا۔ خاص طور سے آمدنی کی تقسیم میں یہ قوتیں غیرمنصفانہ نتائج پیدا کرتی ہیں۔ جس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر مزدوروں کی رسد زیادہ ہو تو ان کی اُجرت کم ہوجاتی ہے اور بسااوقات مزدور اس بات پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ انتہائی کم اُجرت پر کام کریں اور جو پیداوار ان کے گاڑھے پسینے کی محنت سے تیار ہورہی ہے اس میں سے انہیں اتنا بھی حصہ نہ مل سکے جس کے ذریعے وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے صحت

مند زندگی کا انتظام کرسکیں۔ چونکہ ان کی محنت کی طلب رکھنے والے سرمایہ دار کو اس سے غرض نہیں کہ جس اُجرت پر وہ ان سے محنت لے رہا ہے، وہ واقعتاً ان کی محنت کا مناسب صلہ اور ان کی ضروریات کا واقعی کفیل ہے یا نہیں؟ اسے تو صرف اس بات سے غرض ہے کہ رسد کی زیادتی کی وجہ سے وہ اپنی طلب کی تسکین نہایت کم اُجرت پر کرسکتا ہے، جس سے اس کے منافع میں اضافہ ہو، لہٰذا اِشتراکیت کے نظریہ کے مطابق آمدنی کی تقسیم کے لئے رسد و طلب کا فارمولا ایک ایسا بے حس فارمولا ہے جس میں غریبوں کی ضروریات کی رعایت نہیں، بلکہ وہ سرمایہ دار کے ذاتی منافع کے محرک کا تابع ہے اور اسی مدار پر گردش کرتا ہے۔

اسی طرح ترجیحات کے تعین، وسائل کی تخصیص اور ترقی جیسے اہم معاشی مسائل بھی اِشتراکیت کے نزدیک رسد و طلب کی اندھی بہری قوتوں کے حوالے کرنا معاشرے کے لئے نہایت خطرناک ہے۔ ایک نظریاتی فلسفے کے طور پر تو یہ بات دُرست ہوسکتی ہے کہ ذاتی منافع کے محرک کے تحت ایک زراعت پیشہ شخص، یا ایک صنعت کار اس وقت تک اپنی پیداوار جاری رکھے گا جب تک کہ اس کی رسد طلب کے برابر نہ ہوجائے اور جب رسد طلب سے بڑھنے لگے گی تو وہ پیداوار بند کردے گا، لیکن عملی دُنیا میں دیکھا جائے تو کسی تاجر یا زراعت پیشہ کے پاس ایسا کوئی نپا تلا پیمانہ نہیں ہوتا جس کی مدد سے وہ بروقت یہ جان [illegible] کہ اب فلاں پیداوار کی رسد طلب کے برابر ہوگئی ہے، لہٰذا وہ بسا اوقات یہ سوچ کر پیداوار میں اضافہ کرتا جاتا ہے کہ ابھی اس چیز کی رسد ضرورت اور طلب کے مقابلے میں کم ہے، حالانکہ بازار میں حقیقی رسد زیادہ ہوچکی ہوتی ہے اور اسے اس حقیقت کا پتہ کافی دیر میں چلتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بازار میں بسا اوقات ایسی چیزوں کی فراوانی ہوجاتی ہے، جن کی طلب اتنی زیادہ نہیں ہے، اور اس طرح معیشت کساد بازاری کا شکار ہوتی ہے، جس کے نتیجے میں بہت سے کارخانے بند ہوجاتے ہیں، تاجر دیوالیہ ہوجاتے ہیں اور طرح طرح کی معاشی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، لہٰذا محض رسد و طلب کی بنیاد پر ترجیحات کا تعین اتنے توازن کے ساتھ نہیں ہوسکتا، جس کی معاشرے کو واقعی ضرورت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ پھر مذکورہ بالا چاروں مسائل کو حل کرنے کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ اس کے جواب میں اشتراکیت نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ بنیادی خرابی یہاں سے پیدا ہوئی کہ وسائلِ پیداوار یعنی زمینوں اور کارخانوں کو لوگوں کی انفرادی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ **ہونا یہ چاہئے کہ تمام** وسائلِ پیداوار افراد کی شخصی ملکیت میں ہونے کے بجائے **ریاست کی اجتماعی ملکیت میں ہوں**، اور جب یہ سارے وسائل ریاست کی ملکیت میں ہوں گے تو حکومت کو یہ پتہ ہوگا کہ اس کے پاس کل وسائل کتنے ہیں؟ اور معاشرے کی ضروریات کیا کیا ہیں؟ اس بنیاد پر حکومت ایک منصوبہ بندی کرے گی، جس میں یہ طے کیا جائے گا کہ معاشرے کی کن ضروریات کو مقدم رکھا جائے؟ کونسی چیز کس مقدار میں پیدا کی جائے؟ اور مختلف وسائل کو کس ترتیب کے ساتھ کن کن کاموں میں لگایا جائے؟ گویا **ترجیحات کا تعین**، وسائل کی تخصیصات اور ترقی کے تینوں کام **حکومت کی منصوبہ بندی** کے تحت انجام پائیں۔ رہا آمدنی کی تقسیم کا سوال! تو اشتراکیت نے دعویٰ یہ کیا کہ حقیقتاً عاملِ پیداوار صرف دو چیزیں ہیں، زمین اور محنت۔ زمین چونکہ انفرادی ملکیت نہیں بلکہ اجتماعی ملکیت میں ہے، لہٰذا اس پر لگا بندھا کرایہ یا لگان دینے کی ضرورت نہیں۔ اب صرف محنت رہ جاتی ہے، اس کی اُجرت کا تعین بھی **حکومت اپنی منصوبہ بندی کے تحت یہ** بات مدِ نظر رکھتے ہوئے کرے گی کہ مزدوروں کو ان کی محنت کا مناسب صلہ ملے۔

جس طرح سرمایہ دارانہ نظام نے مذکورہ چاروں بنیادی مسائل کو صرف ذاتی منافع کے محرک اور بازار کی قوتوں کی بنیادوں پر حل کرنا چاہا تھا، اسی طرح اشتراکیت نے ان چاروں مسائل کے حل کے لئے ایک ہی بنیادی حل تجویز کیا، یعنی منصوبہ بندی۔ اسی لئے اشتراکی معیشت کو منصوبہ بند معیشت (Planned Economy) کہا جاتا ہے، جس کا عربی ترجمہ "**الاقتصاد موجهة**" یا "**اقتصاد مخطط**" کیا گیا ہے۔

اشتراکیت کے بنیادی اُصول

اشتراکیت کے مذکورہ بالا فلسفے کے نتیجے میں اشتراکی معیشت میں مندرجہ

ذیل بنیادی اُصول کارفرما ہوتے ہیں:-

۱- اجتماعی ملکیت (Collective Property)

اشتراکیت کے مذکورہ اُصول کا مطلب یہ ہے کہ وسائلِ پیداوار یعنی زمینیں اور کارخانے وغیرہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت میں نہیں ہوں گے بلکہ وہ قومی ملکیت میں ہوں گے، اور حکومت کے زیرِ انتظام چلائے جائیں گے، ذاتی استعمال کی اشیاء ذاتی ملکیت ہوسکتی ہیں، لیکن وسائلِ پیداوار پر کوئی ذاتی ملکیت نہیں ہوسکتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹھیٹ اشتراکی ممالک میں نہ صرف زمینیں اور کارخانے، بلکہ تجارتی دُکانیں بھی کسی فردِ واحد کی ملکیت میں نہیں ہوتیں، ان میں کام کرنے والے افراد سب حکومت کے ملازم ہوتے ہیں اور حاصل ہونے والی آمدنی تمام تر سرکاری خزانے میں جاتی ہے، اور کام کرنے والے ملازمین کو تنخواہ یا اُجرت حکومت کی منصوبہ بندی کے تحت دی جاتی ہے۔

۲-منصوبہ بندی (Planning)

اشتراکی نظام کا دُوسرا بنیادی اُصول منصوبہ بندی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام بنیادی معاشی فیصلے حکومت منصوبہ بندی کے تحت انجام دیتی ہے، اس منصوبہ بندی میں تمام معاشی ضروریات اور تمام معاشی وسائل کے اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہیں اور یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ کونسے وسائل کس چیز کی پیداوار میں لگائے جائیں؟ اور کونسی چیز کس مقدار میں پیدا کی جائے؟ اور نیز کس شعبے میں محنت کرنے والوں کی کیا اُجرت مقرر کی جائے؟

حکومت کی طرف سے معیشت کی منصوبہ بندی کا تصوّر اَصلاً تو اِشتراکیت نے پیش کیا تھا، لیکن رفتہ رفتہ سرمایہ دار ملکوں نے بھی جزوی طور پر منصوبہ بندی اختیار کرنی شروع کردی، جس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دار ممالک رفتہ رفتہ اپنے اس اُصول پر مکمل طور پر قائم نہ رہ سکے کہ حکومت معیشت کے کاروبار میں بالکل مداخلت نہ کرے، بلکہ مختلف اجتماعی مقاصد کے تحت سرمایہ دار حکومتوں کو بھی تجارت و معیشت میں کچھ نہ

کچھ مداخلت کرنی پڑی، یہاں تک کہ **مخلوط معیشت** (Mixed Economy) کے نام سے ایک نئی اِصطلاح وجود میں آئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بنیادی طور پر معیشت کو بازار کی قوتوں کے تحت ہی چلایا جائے لیکن ضرورت کے تحت تجارت و صنعت کے **بعض شعبے خود سرکاری تحویل میں بھی ہوسکتے** ہیں، جیسے بعض سرمایہ دار ملکوں میں **ریلوے، بجلی، ٹیلیفون اور فضائی سروس** وغیرہ سرکاری تحویل میں ہوتی ہے، اور جو تجارتیں نجی طور پر چلائی جارہی ہیں، **حکومت** ان کو بھی **کچھ قواعد وضوابط کا پابند** بنادیتی ہے۔ پہلی قسم کی تجارتوں کو سرکاری شعبہ (**Public Sector**) اور دُوسری قسم کو نجی شعبہ (**Private** Sector) کہا جاتا ہے۔ اب اس مخلوط معیشت میں چونکہ حکومت کی فی الجملہ **مداخلت** ہوتی ہے، اس لئے جزوی طور پر اسے منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے، اس جزوی **منصوبہ** بندی کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے عموماً پنچ سالہ **منصوبے** تیار کئے جاتے ہیں، لیکن یہ جزوی **منصوبہ** بندیاں ہیں جبکہ اِشتراکیت کی **منصوبہ بندی، کلی منصوبہ** بندی ہے، یعنی اس میں ہر معاشی فیصلہ اس سرکاری منصوبہ بندی کا تابع ہوتا ہے۔

۳- اِجتماعی مفاد (Collective Interest)

اِشتراکیت کا تیسرا اُصول اِجتماعی مفاد ہے، یعنی اشتراکیت کا دعویٰ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ **معیشت** میں ساری **معاشی** سرگرمیاں افراد کے ذاتی مفاد کے تابع ہوتی ہیں، لیکن اِشتراکی نظام میں **منصوبہ** بندی کے تحت اِجتماعی مفاد کو بنیادی طور پر مدِّنظر رکھا جاتا ہے۔

۴- آمدنی کی منصفانہ تقسیم (Equitable Distribution of Income)

اِشتراکیت کا چوتھا اُصول یہ ہے کہ پیداوار سے جو کچھ آمدنی حاصل ہو، وہ افراد کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم ہو، اور غریب و اَمیر کے درمیان زیادہ فاصلے نہ ہوں، آمدنیوں میں توازن ہو۔ شروع میں دعویٰ یہ کیا گیا تھا کہ اِشتراکیت میں آمدنی کی **مساوات ہوگی**، یعنی سب کی آمدنی برابر ہوگی، لیکن عملاً ایسا کبھی نہیں ہوا، لوگوں کی اُجرتیں **اور تنخواہیں کم زیادہ ہوتی رہیں**۔ البتہ اِشتراکیت میں کم سے کم یہ دعویٰ ضرور کیا گیا ہے کہ اس نظام میں تنخواہوں اور اُجرتوں کے درمیان تفاوت بہت زیادہ نہیں ہے۔

دونوں نظاموں پر تبصرہ

اشتراکیت اور سرمایہ داری کے درمیان ایک صدی سے زیادہ مدت تک شدید معرکہ آرائی رہی۔ فکری سطح پر دونوں کے درمیان بحث و مناظرے کا بازار بھی گرم رہا اور سیاسی سطح پر جنگ و پیکار کا بھی، دونوں طرف سے ایک دوسرے پر جو تنقیدیں ہوتی رہی ہیں اور اس موضوع پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک پورا کتب خانہ بھر سکتا ہے۔ یہاں ان تمام تنقیدوں کو پیش کرنا تو ممکن نہیں، لیکن اختصار کے ساتھ دونوں نظاموں پر اُصولی تبصرہ کیا جاسکتا ہے، جو میں یہاں مختصراً پیش کرنا چاہتا ہوں۔

اِشتراکی نظام پر تبصرہ

پہلے اشتراکیت پر تبصرہ کرنا اس لحاظ سے مناسب ہے کہ اس کی خرابیوں کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ اشتراکیت کی اتنی بات تو واقعی دُرست تھی کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو اتنی کھلی چھوٹ دے دی گئی کہ اس کے نتیجے میں فلاحِ عامہ کا تصوّر یا تو بالکل باقی نہیں رہا، یا بہت پیچھے چلا گیا، لیکن اس کا جو حل اِشتراکیت نے تجویز کیا وہ بذاتِ خود بہت اِنتہاپسندانہ تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام نے فرد کو اِتنا آزاد اور بے لگام چھوڑ دیا تھا کہ وہ اپنے منافع کے خاطر جو چاہے کرتا پھرے، اس کے مقابلے میں اشتراکیت نے فرد کو اتنا گھونٹ دیا کہ اس کی فطری آزادی بھی سلب ہو کر رہ گئی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد وطلب کو تمام مسائل کا حل قرار دیا لیکن اشتراکیت نے ان قدرتی قوانین کو تسلیم کرنے ہی سے انکار کر دیا، اور اس کی جگہ سرکار کی طرف سے کی ہوئی منصوبہ بندی کو ہر مرض کا علاج قرار دیا، حالانکہ انسان کی اپنی وضع کی ہوئی منصوبہ بندی ہر جگہ کام نہیں دیتی اور بہت سے مقامات پر اس کا نتیجہ ایک مصنوعی جکڑ بند کے علاوہ کچھ نہیں نکلتا۔

انسان کو اپنی زندگی میں بہت سے معاشرتی مسائل پیش آتے ہیں، ان سب

مسائل کو پلاننگ کی بنیاد پر حل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ مثلاً ایک معاشرتی مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہر مرد کو شادی کے لئے مناسب بیوی درکار ہے، اور عورت کو مناسب شوہر، یہ معاشرتی مسئلہ ابتدائے آفرینش سے آج تک لوگوں کی ذاتی پسند و ناپسند اور لوگوں کے ذاتی فیصلوں کی بنیاد پر طے ہوتا رہا ہے۔ ہر شخص اپنے لئے مناسب رفیقِ حیات تلاش کرتا ہے اور جس پر دونوں کا اتفاق ہوجائے، شادی عمل میں آجاتی ہے۔ اس نظام کے نتیجے میں بے شک بعض خرابیاں سامنے آئیں، مثلاً یہ ذاتی فیصلہ بعض اوقات غلط بھی ہوجاتا ہے جس کے نتیجے میں ناچاقی اور نااتفاقی پیدا ہوجاتی ہے، اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی عورت یا کوئی مرد اس لئے نکاح سے محروم رہ جاتا ہے کہ اس کی طرف کسی کو کوئی کشش نہیں ہوتی، لیکن ان خرابیوں کا یہ علاج آج تک کسی نے نہیں سوچا کہ شادیوں کے نظام کو ذاتی پسند اور ناپسند کے بجائے سرکار کے حوالے کردینا چاہئے، وہی منصوبہ بندی کرے کہ کتنے مرد اور کتنی عورتیں ہیں، اور کونسا مرد کس عورت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اگر کوئی حکومت یا ریاست اس قسم کی کوئی منصوبہ بندی کرنا چاہے، تو ظاہر ہے کہ یہ ایک غیر فطری اور مصنوعی نظام ہوگا، جس سے کبھی خوش گوار نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔

اسی طرح یہ مسئلہ کہ انسان کونسا پیشہ اختیار کرے؟ پیدائش کے کس عمل میں کتنا حصہ لے؟ یا کس انداز سے اپنی خدمات معاشرے کو پیش کرے؟ درحقیقت ایک معاشرتی مسئلہ ہے، اس مسئلے کو اگر صرف خشک منصوبہ بندی کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے مندرجہ ذیل خرابیاں لازم آئیں گی:-

۱- منصوبہ بندی کا کام ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام میں حکومت انجام دیتی ہے، اور حکومت فرشتوں کے کسی گروہ کا نام نہیں، جس سے کوئی غلطی یا بددیانتی سرزد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ حکومت کرنے والے بھی گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں، وہ اپنی خواہشات اور ذاتی مفادات سے بھی مغلوب ہوسکتے ہیں، اور ان کی سوچ میں بھی غلطی کا امکان ہے۔ دوسری طرف جب سارے ملک کے تمام وسائل پیداوار انسانوں کے اس گروہ کے حوالے کردیئے گئے تو ان کی نیت میں فتور آنے کی صورت میں اس کے

نتائج پوری قوم کو بھگتنے پڑیں گے۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام میں ایک چھوٹا سرمایہ دار محدود وسائل پیداوار پر ملکیت حاصل کر کے چند افراد کو ظلم کا نشانہ بنا سکتا ہے تو اشترا کی نظام میں چند برسر اقتدار افراد پورے ملک کے وسائل پر قابض ہو کر اس سے کہیں زیادہ ظلم کر سکتے ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ بہت سارے چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو جائیں اور ان سب کی جگہ ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں آجائے جو دولت کے سارے وسائل کو من مانے طریقے سے استعمال کرے۔

۲- اشتراکیت کا منصوبہ بند نظام ایک انتہائی طاقت ور بلکہ جابر حکومت کے بغیر نہ قائم ہو سکتا ہے اور نہ چل سکتا ہے، کیونکہ افراد کو ہمہ گیر ریاست کی منصوبہ بندی کے تابع بنانے کے لئے ریاستی جبر لازم ہے، کیونکہ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے بجائے ریاستی منصوبہ بندی کے تحت کام کرنا پڑتا ہے، اس لئے یہ منصوبہ بندی ایک زبردست قوتِ قاہرہ کے بغیر کام نہیں کر سکتی۔ چنانچہ اشترا کی نظام میں سیاسی آزادیوں کا خاتمہ لازمی ہے، اور اس طرح فرد کی آزادی بہر طور کچلی جاتی ہے۔

۳- چونکہ اشتراکیت میں ذاتی منافع کے محرک کا بالکل خاتمہ کر دیا جاتا ہے، اس لئے لوگوں کی کارکردگی پر اس کا برا اثر پڑتا ہے۔ انسان یہ سوچتا ہے کہ وہ خواہ چستی اور محنت اور اُپج کے ساتھ کام کرے یا سستی اور کاہلی کے ساتھ، دونوں صورتوں میں اس کی آمدنی یکساں ہے، اس لئے اس میں بہتر کارکردگی کا ذاتی جذبہ برقرار نہیں رہتا۔ ذاتی منافع کا محرک علی الاطلاق بری چیز نہیں، بلکہ اگر وہ اپنی حد میں ہو تو انسان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور اسے نت نئی مہم جوئی پر آمادہ کرتا ہے، اس فطری جذبے کو حد میں رکھنے کے لئے لگام دینے کی بے شک ضرورت ہے، لیکن اس کو بالکلیہ کچل دینے سے انسان کی بہت سی صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

یہ تمام خرابیاں محض نظریاتی نوعیت کی نہیں ہیں، بلکہ اشتراکیت کی پہلی تجربہ گاہ روس میں چوہتر سال کے تجربے نے یہ تمام خرابیاں پوری طرح ثابت کر دی ہیں۔ ایک زمانے میں ابھی کچھ عرصہ پہلے تک اشتراکیت اور نیشنلائزیشن کا طوطی بولتا تھا، اور جو شخص اس کے خلاف زبان کھولتا اسے رجعت پسند اور سرمایہ دار کا ایجنٹ کہا جاتا

تھا، لیکن سوویت یونین کے خاتمے کے موقع پر خود رُوس کے صدر یلسن نے کہا کہ:-

> کاش! اشتراکیت "UTOPIAN"(1) نظریے کا تجربہ رُوس جیسے عظیم ملک میں کرنے کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے رقبے میں کرلیا گیا ہوتا، تاکہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے کے لئے چوہتر سال نہ لگتے۔ (نیوز ویک)

سرمایہ دارانہ نظام پر تبصرہ

اب مختصراً سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے پر تبصرہ کرنا ہے۔ اِشتراکیت کی ناکامی کے بعد سرمایہ دار مغربی ممالک میں بڑے شدّ و مدّ کے ساتھ بغلیں بجائی جارہی ہیں اور یہ دعویٰ کیا جارہا ہے کہ چونکہ اِشتراکیت عمل کی دُنیا میں ناکام ہوگیا، اس لئے سرمایہ دارانہ نظام کی حقانیت ثابت ہوگئی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اِشتراکیت کی ناکامی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مروّجہ سرمایہ دارانہ نظام برحق تھا، بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اِشتراکیت نے سرمایہ دارانہ نظام کی حقیقی غلطیوں کی اصلاح کے بجائے ایک دُوسرا غلط راستہ اختیار کرلیا، لہٰذا اب سرمایہ دارانہ نظام کی فکری غلطیوں کو زیادہ باریک بینی کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی فلسفے میں اس حد تک تو بات دُرست تھی کہ معاشی مسائل کے حل کے لئے ذاتی منافع کے محرک اور بازار کی قوتوں یعنی رسد و طلب سے کام لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا

---

(1) UTOPIAN کا ترجمہ ''لامکان'' ہے، اور یہ درحقیقت ایک کتاب کا نام تھا، جو قدیم زمانے کے کسی لاطینی یا یونانی بادشاہ نے لکھی تھی، جس میں ایک خیالی ریاست کا تصور پیش کیا گیا تھا، جہاں تمام اشیاء انسانوں کی مشترک ملکیت ہیں، ہر شخص جو چیز چاہتا ہے اپنی خواہش کے مطابق قیمت دیئے بغیر حاصل کرلیتا ہے، اور کسی پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ چونکہ ایک ناممکن العمل تصور تھا، اس لئے یہ لفظ ایک خیالی جنت کے معنی میں استعمال ہونے لگا، جس کے حاصل کرنے کا کوئی امکان نہ ہو، اور جو کوئی شخص اس ذہن کے خیالی منصوبے بنائے اس کو "UTOPIAN" کہا جاتا ہے۔

ہے، لیکن غلطی درحقیقت یہاں سے لگی ہے کہ ایک فرد کو زیادہ سے زیادہ منافع کے حصول کی بے لگام آزادی دی گئی، جس میں حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں تھی، اور نہ اجتماعی فلاح کی طرف خاطر خواہ توجہ تھی، چنانچہ اس کے لئے ایسے طریقے اختیار کرنا بھی جائز ہوگیا جن کے نتیجے میں وہ زیادہ سے زیادہ دولت مند بن کر بازار پر اپنی اجارہ داری (Monopoly) قائم کرلے۔ اجارہ داری کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص چیز کی رسد فراہم کرنا ایک شخص یا ایک گروپ میں منحصر ہوکر رہ جائے، یعنی صورت حال ایسی پیدا ہوجائے کہ اس شخص یا گروپ کے سوا کوئی اور وہ چیز پیدا نہ کرپائے۔ اس اجارہ داری کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ وہ چیز اس کی مقرر کی ہوئی من مانی قیمت پر لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔

انسان کے ذاتی منافع کے محرک کو کھلی چھوٹ دینے اور اس پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے نتیجے میں جو خرابیاں سرمایہ دار معاشرے میں پیدا ہوئیں، وہ مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

۱- چونکہ منافع کے حصول کے لئے حلال وحرام کی کوئی تفریق نہیں تھی، اس لئے اس سے بہت سی اخلاقی برائیاں معاشرے میں پھیلیں، اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کا محرک اکثر لوگوں کے سفلی جذبات کو اپیل کرکے ان کی غلط خواہشات کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے، جس سے معاشرے میں اخلاقی بگاڑ پھیلتا ہے۔ چنانچہ مغربی ممالک میں عریانی اور فحاشی کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے، عریاں تصاویر اور فلموں کا ایک سیلاب ہے جسے معاشرے میں پھیلا کر لوگ ذاتی منافع کے حصول کی تسکین کر رہے ہیں، عورتیں اپنے جسم کا ایک ایک عضو اس محرک کے تحت بازار میں فروخت کر رہی ہیں۔ ابھی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق سروسز کے کاروبار میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار ماڈل گرلز کا ہے، جو اپنی تصویریں صنعت کاروں کو اپنی مصنوعات پر چھاپنے کے لئے یا اشتہار کا حصہ بنانے کے لئے فراہم کرتی ہیں، اور اس کا بہت بھاری معاوضہ وصول کرتی ہیں، یہاں تک کہ ان کا طبقہ امریکہ کے سب سے زیادہ کمانے والوں میں شامل ہے۔ ظاہر ہے کہ ان پر جو لاکھوں ڈالر خرچ

کئے جاتے ہیں وہ بالآخر پیداوار کی لاگت میں شامل ہوکر عام صارفین کی جیب پر پڑتے ہیں، اور اس طرح پوری قوم ان بداخلاقیوں کی مالی قیمت بھی ادا کرتی ہے۔

۲- چونکہ ذاتی منافع کے حصول پر کوئی خاص اخلاقی پابندی عائد نہیں، اس لئے ترجیحات کے تعین اور وسائل کی تخصیص میں اجتماعی مصالح کا کما حقہٗ لحاظ نہیں ہو پاتا، جب زیادہ منافع کا حصول ہی منتہائے مقصود ٹھہرا تو اگر یہ زیادہ منافع عریاں فلموں کے ذریعے حاصل ہو رہا ہو تو ایک شخص بے گھر لوگوں کو مکان فراہم کرنے میں روپیہ کیوں لگائے؟ جبکہ مقابلتاً اس میں نفع کم ہو۔

۳- ذاتی منافع کے محرک پر حلال و حرام کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے سود، قمار، سٹہ وغیرہ سب سرمایہ دارانہ نظام میں جائز ہیں، حالانکہ یہ وہ چیزیں ہیں کہ جو معیشت کے فطری توازن میں بگاڑ پیدا کرتی ہیں، جس کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ ان کے نتیجے میں بکثرت اِجارہ داریاں قائم ہوجاتی ہیں، اور ان اِجارہ داریوں کی موجودگی میں بازار کی فطری قوتیں یعنی رسد و طلب کے قوانین مفلوج ہوجاتے ہیں اور کما حقہٗ کام نہیں کر پاتے۔ یعنی ایک طرف تو سرمایہ دارانہ نظام کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم مارکیٹ کی قوتوں یعنی رسد و طلب سے کام لینا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف ذاتی منافع کے محرک کو بے مہار چھوڑ کر اس میں اِجارہ داریوں کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں، جن سے رسد و طلب کی قوتیں ناکارہ یا بے اثر ہوجاتی ہیں۔

اس کی تھوڑی سی تشریح یہ ہے کہ رسد و طلب کی قوتیں معیشت میں توازن پیدا کرنے کے لئے اس وقت کارآمد ہوتی ہیں جب بازار میں آزاد مقابلے (Free Competition) کی فضا ہو، لیکن جب کسی شخص کی اِجارہ داری قائم ہوجائے تو قیمتوں کا نظام متوازن نہیں رہتا اور معیشت کے چار بنیادی مسائل کے بارے میں ہونے والے فیصلے معاشرے کی حقیقی ضرورت اور طلب کی عکاسی نہیں کرتے، اور یہاں بھی ایک مصنوعی نظام وجود میں آجاتا ہے۔ اس بات کو ایک مثال سے سمجھیں مثلاً چینی کی پیداوار ضرورت کے مطابق اتنی ہونی چاہئے کہ بازار میں اس کی مناسب قیمت رسد و طلب کے ذریعے متعین ہوجائے، لیکن مناسب قیمت پر تعین اس وقت

ممکن ہے جب چینی بنانے کے لئے مختلف کارخانے موجود ہوں، اور خریدنے والے کو یہ اختیار ہو کہ اگر ایک کارخانے کی چینی مہنگی ہے تو وہ دوسرے کارخانے سے خرید سکے۔ اگر بازار میں یہ مقابلے کی فضا ہو تو کوئی بھی کارخانہ قیمت کے تعین میں من مانی نہیں کرسکتا، اس صورت میں بازار میں چینی کی جو ایک قیمت متعین ہوگی، وہ واقعتاً طلب و رسد کے توازن سے وجود میں آئے گی اور متوازن قیمت ہوگی۔ لیکن اگر ایک ہی شخص چینی کے کاروبار کا اجارہ دار بن گیا اور لوگ صرف اسی سے چینی خریدنے پر مجبور ہیں تو پھر لوگوں کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوتا کہ اس کی مقرر کی ہوئی قیمت پر چینی خریدیں۔ ایسی صورت میں چینی کی جو قیمت ہوگی وہ یقیناً اس صورت سے زیادہ ہوگی جب بازار میں ایک سے زیادہ چینی فراہم کرنے والے ہوتے، اور ان میں تجارتی مقابلہ ہوتا۔ فرض کیجئے کہ آزاد مقابلے کی صورت میں چینی کی قیمت ۸ روپے کلو ہوتی، تو اجارہ داری کی صورت میں وہ دس یا بارہ روپے کلو ہوسکتی ہے، اب اگر لوگ بارہ روپے میں چینی خرید رہے ہیں تو یہ معاملہ ان کی حقیقی طلب کی نمائندگی نہیں کر رہا ہے، بلکہ ایک مصنوعی صورتِ حال کی نمائندگی کر رہا ہے جو چینی کے ایک تاجر کی اجارہ داری سے پیدا ہوئی، اور اس طرح اجارہ داری نے حقیقی طلب و رسد کے نظام کو بگاڑ دیا۔

لہٰذا اگرچہ یہ کہنا دُرست تھا کہ معاشی مسائل کا فیصلہ بڑی حد تک طلب و رسد کی طاقتوں کو کرنا چاہئے، لیکن اس مقصد کے حصول کے لئے جب ذاتی منافع کے محرک کو حلال و حرام کی تفریق کے بغیر بے مہار چھوڑا گیا تو اس نے اجارہ داریاں قائم کر کے خود طلب و رسد کی قوتوں کو ٹھیک کام کرنے سے روک دیا، اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے ایک اُصول نے عملاً خود اپنے دُوسرے اُصولوں کی نفی کردی۔

۴- اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام کا اصل تصور یہ تھا کہ کاروبار اور تجارت میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو، لیکن رفتہ رفتہ تجربات سے گزرنے کے بعد عملاً یہ اُصول پوری طرح برقرار نہیں رہ سکا، تقریباً تمام سرمایہ دارانہ ممالک میں حکومت کی طرف سے کچھ نہ کچھ مداخلت ہوتی رہی ہے۔ مثلاً حکومت مختلف قوانین کے ذریعے بالخصوص ٹیکسوں کے ذریعے کسی تجارت کی ہمت افزائی اور کسی کی ہمت شکنی کرتی رہی ہے، اور اب

شاید کوئی سرمایہ دار ملک ایسا نہیں ہے جس میں کاروبار اور تجارت پر حکومت کی طرف سے کوئی نہ کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ لہٰذا حکومت کی عدمِ مداخلت (Laissez Faire) کے اُصول پر صحیح طور سے عمل کرنے والا دُنیا میں کوئی ملک موجود نہیں۔ لیکن حکومت کی یہ مداخلتیں بسااوقات تو نوکرشاہی اور سرمایہ داروں کے باہمی گٹھ جوڑ کا نتیجہ ہوتی ہیں، جن کا فائدہ صرف بااثر سرمایہ داروں کو پہنچتا ہے اور اس کی وجہ سے اجتماعی فلاح و بہبود حاصل نہیں ہوتی، اور اگر یہ پابندیاں اس قسم کے گٹھ جوڑ اور بددیانتی سے خالی ہوں تب بھی وہ خالص سیکولر سوچ پر مبنی ہوتی ہیں، اپنی عقل کی روشنی میں جو پابندی مناسب سمجھی لگادی، حالانکہ تنہا عقل تمام انسانی مسائل حل کرنے کے لئے ناکافی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ پابندیاں معاشی ناہمواریوں کا صحیح علاج نہیں بن سکیں۔

۵- سرمایہ دارانہ نظام میں خاص طور پر تقسیمِ دولت کا نظام ناہمواری کا شکار رہتا ہے، اس ناہمواری کا ایک بڑا سبب سود اور قمار ہے، اس کے نتیجے میں دولت کے بہاؤ کا رُخ امیروں کی طرف رہتا ہے، غریبوں اور عوام کی طرف نہیں ہوتا۔ اس کی پوری تشریح اِن شاء اللہ تقسیمِ دولت پر گفتگو کرتے ہوئے آگے آئے گی۔

معیشت کے اسلامی اَحکام

سرمایہ داری اور اِشتراکیت کے مختصر تعارف کے بعد اَب میں مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ معیشت کے جو چار بنیادی مسائل بیان کئے گئے تھے، ان کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے؟ یہ بات پہلے ہی قدم پر واضح رہنی چاہئے کہ اسلام کوئی معاشی نظام نہیں ہے، بلکہ وہ ایک دِین ہے، جس کے احکام ہر شعبۂ زندگی سے متعلق ہیں، جس میں معیشت بھی داخل ہے، لہٰذا قرآن و حدیث نے معروف معنوں میں کوئی معاشی فلسفہ یا نظریہ پیش نہیں کیا، جس کو موجودہ دور کی معاشی اِصطلاحات میں تعبیر کیا گیا ہو۔ لہٰذا ترجیحات کا تعین، وسائل کی تخصیص، آمدنی کی تقسیم اور ترقی کے عنوان سے قرآن وسنت یا اسلامی فقہ میں براہِ راست کوئی بحث موجود نہیں ہے، لیکن زندگی کے دُوسرے شعبوں کی طرح اسلام نے معیشت کے بارے میں بھی کچھ

احکام دیئے ہیں، ان احکام کے مجموعی مطالعے سے ہم یہ مستنبط کر سکتے ہیں کہ مذکورہ چار مسائل کے سلسلے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ اور اسی مطالعے اور استنباط کا حاصل اس وقت پیش کرنا مقصود ہے۔

اسلام کے معاشی احکام اور تعلیمات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں یعنی رسد و طلب کے قوانین کو تسلیم کیا ہے، اور وہ معیشت کے مسائل کے حل کے لئے ان کے استعمال کا فی الجملہ حامی ہے، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا.

(الزخرف:۳۲)

ترجمہ:- ہم نے ان کے درمیان معیشت کو تقسیم کیا ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر درجات میں فوقیت دی ہے تاکہ ان میں سے ایک، دوسرے سے کام لے سکے۔

ظاہر ہے کہ ایک دوسرے سے کام اس طرح لیا جائے گا کہ کام لینے والا کام کی طلب، اور کام دینے والا کام کی رسد ہے۔ اس طلب و رسد کی باہمی کشمکش اور باہمی امتزاج سے ایک متوازن معیشت وجود میں آتی ہے۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جب دیہاتی اپنی زرعی پیداوار شہر میں فروخت کرنے کے لئے لاتا تو بعض شہری لوگ اس دیہاتی سے کہتے کہ تم اپنا مال خود لے جا کر شہر میں مت بیچو، بلکہ یہ سامان مجھے دے دو، میں مناسب وقت پر اس کو فروخت کروں گا، تاکہ اس کی قیمت زیادہ ملے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شہریوں کو ایسا کرنے سے روکا، اور اس کے ساتھ ہی یہ جملہ ارشاد فرمایا۔-

دعوا الناس يرزق الله بعضهم عن بعض.

ترجمہ۔- لوگوں کو آزاد چھوڑ دو تاکہ اللہ تعالیٰ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمائے۔

اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیچنے اور خریدنے والے کے درمیان تیسرے شخص کی مداخلت کو اس لئے مسترد فرمادیا تاکہ بازار میں طلب و رسد کا صحیح توازن قائم ہو۔ ظاہر ہے کہ دیہاتی جب براہِ راست بازار میں کوئی چیز فروخت کرے گا تو اپنا مناسب نفع رکھ کر ہی فروخت کرے گا، لیکن اسے چونکہ جلدی واپس جانا ہے، اس لئے اس کے پاس ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نہیں اور خود اس کے بازار میں پہنچنے کی صورت میں طلب و رسد کا ایسا امتزاج ہوگا جو صحیح قیمت متعین کرنے میں مدد دے گا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی تیسرا آدمی ان دونوں کے درمیان آجائے اور مال کی ذخیرہ اندوزی کرکے اس کی مصنوعی قلّت پیدا کرے، تو وہ طلب و رسد کے قدرتی نظام میں بگاڑ پیدا کرے گا۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طلب و رسد کے قدرتی نظام کو تسلیم فرمایا اور اس کو باقی رکھنے کی کوشش فرمائی۔

اسی طرح جب آپ سے یہ درخواست کی گئی کہ آپ بازار میں فروخت ہونے والی اشیاء کی قیمتیں سرکاری طور پر متعین فرمادیں، تو اس موقع پر بھی حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:-

ان اللہ هو المسعر القابض الباسط الرازق.

ترجمہ:- بے شک اللہ تعالیٰ ہی قیمت متعین کرنے والے ہیں.
وہی چیزوں کی رسد میں کمی کرنے والے اور زیادتی کرنے والے
ہیں، اور وہی رازق ہیں۔

اللہ تعالیٰ کو قیمت مقرّر کرنے والا قرار دینے کا واضح مطلب اس حدیث کے سیاق میں یہ بھی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے طلب و رسد کے فطری اُصول مقرّر فرمائے ہیں، جن سے قیمتیں فطری طور پر متعین ہوتی ہیں اور اس فطری نظام کو چھوڑ کر مصنوعی طور سے قیمتوں کا تعین پسندیدہ نہیں۔

قرآن وسنت کے ان ارشادات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے بازار کی قوتوں یعنی طلب و رسد کے قوانین کو فی الجملہ تسلیم کیا ہے، اسی طرح ذاتی

منافع کے محرک سے بھی فی الجملہ کام لیا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں اس محرک کو بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا، جس کے نتیجے میں وہ خرابیاں پیدا ہوئیں جن کا ذکر پیچھے کیا گیا۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک کو برقرار رکھتے ہوئے اور رسد و طلب کے قوانین کو تسلیم کرتے ہوئے تجارتی اور معاشی سرگرمیوں پر کچھ ایسی پابندیاں عائد کردیں کہ ان پر عمل کی صورت میں ذاتی منافع کا محرک ایسے غلط رُخ پر نہیں چل سکتا جو معیشت کو غیر متوازن کرے یا اس سے دُوسری اخلاقی یا اجتماعی خرابیاں پیدا ہوں۔ اسلام نے ذاتی منافع کے محرک پر جو پابندیاں عائد کی ہیں، انہیں تین قسموں پر منقسم کیا جاسکتا ہے:-

۱- خدائی پابندی

سب سے پہلے تو اسلام نے معاشی سرگرمیوں پر حلال وحرام کی کچھ ایسی ابدی پابندیاں عائد کی ہیں جو ہر زمانے میں اور ہر جگہ نافذ العمل ہیں۔ مثلاً سود، قمار، سٹہ، اکتناز، احتکار، یعنی ذخیرہ اندوزی اور دُوسری تمام بیوع باطلہ کو کلی طور پر ناجائز قرار دے دیا، کیونکہ یہ چیزیں عموماً اجارہ داریوں کے قیام کا ذریعہ بنتی ہیں اور ان سے معیشت میں ناہمواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی طرح ان تمام چیزوں کی پیداوار اور خرید و فروخت کو حرام قرار دیا جن سے معاشرہ کسی بداَخلاقی کا شکار ہو، اور جس میں لوگوں کے سفلی جذبات بھڑکا کر ناجائز طریقے سے آمدنی حاصل کرنے کا راستہ پیدا کیا جائے۔

یہاں یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ یہ خدائی پابندیاں قرآن وسنت کے ذریعے عائد کی گئی ہیں، انہیں اسلام نے انسان کی ذاتی عقل پر نہیں چھوڑا کہ اگر اس کی عقل مناسب سمجھے تو یہ پابندی عائد کردے، اور اگر مناسب نہ سمجھے تو عائد نہ کرے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز کی اچھائی یا بُرائی کا فیصلہ کرنے کے لئے بسااوقات انسانوں کی عقلوں میں تفاوت اور اختلاف ہوتا ہے۔ ایک انسان کی عقل ایک چیز کو اچھا اور دوسرے انسان کی عقل اس کو بُرا سمجھ سکتی ہے، لہٰذا اگر ان پابندیوں کو بھی محض عقلِ انسانی کے حوالے کیا جاتا تو اس بات کا اِمکان تھا کہ لوگ ان پابندیوں کو اپنی عقل کی

روشنی میں نامناسب قرار دے کر معاشرے کو ان سے آزاد کر دیتے۔ اور چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم میں یہ پابندیاں ہر زمانے اور ہر جگہ کے لئے ضروری تھیں اس لئے ان کو وحی کے ذریعے ابدی حیثیت دی گئی، تاکہ انسان اپنی عقلی تاویلات کے سہارے ان سے چھٹکارا حاصل کر کے معیشت اور معاشرے کو ناہمواریوں میں مبتلا نہ کر سکے۔

یہیں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ خدائی پابندیاں جو قرآن وسنت نے عائد کی ہیں، بہرصورت واجب العمل ہیں، خواہ انسان کو ان کی عقلی حکمت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا، موجودہ دور میں بیشتر سرمایہ دار ممالک بھی ذاتی منافع کے محرک پر کچھ نہ کچھ پابندیاں ضرور عائد کرتے ہیں، لیکن وہ پابندیاں چونکہ وحیٔ الٰہی سے مستفید نہیں ہوتیں، اس لئے وہ متوازن معیشت کے قیام کے لئے کافی نہیں ہوتیں۔ چنانچہ ان سرمایہ دار ملکوں میں کہیں بھی سود، قمار اور سٹہ وغیرہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی، جو معاشی ناہمواریوں کا بہت بڑا سبب ہیں۔

۲- ریاستی پابندیاں

مذکورہ خدائی پابندیاں تو اَبدی نوعیت کی تھیں، انہی کے ساتھ اسلامی شریعت نے حکومتِ وقت کو یہ اِختیار بھی دیا ہے کہ وہ کسی عمومی مصلحت کے تحت کسی ایسی چیز یا ایسے فعل پر بھی پابندی عائد کرسکتی ہے جو بذاتِ خود حرام نہیں بلکہ مباحات کے دائرے میں آتی ہے، لیکن اس سے کوئی اجتماعی خرابی لازم آتی ہے۔ یہ پابندی ابدی نوعیت کی نہیں ہوتی جو ہر زمانے میں اور ہر جگہ نافذ العمل ہو، بلکہ اس کی حیثیت وقتی حکم کی ہوتی ہے جو وقتی مصلحت کے تابع ہوتا ہے۔ اس کی سادہ سی مثال یہ ہے کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ جب ہیضے کی وبا پھوٹ رہی ہو تو حکومت یہ پابندی لگا سکتی ہے کہ خربوزے کی خرید وفروخت اور اس کا کھانا ممنوع ہے۔ جب تک حکومت کی طرف سے ایسی یہ پابندی باقی رہے، اس وقت تک خربوزہ کھانا اور اس کا بیچنا شرعاً بھی ناجائز ہو جائے گا۔ اسی طرح اُصولِ فقہ میں "سدِّ ذرائع" کے نام سے ایک مستقل

باب ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک کام فی نفسہ جائز ہو لیکن اس کی کثرت کسی معصیت یا مفسدے کا سبب بن رہی ہو تو حکومت کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اس جائز کام کو بھی ممنوع قرار دیدے۔

اس اُصول کے تحت حکومت تمام معاشی سرگرمیوں کی نگرانی کرسکتی ہے اور جن سرگرمیوں سے معیشت میں ناہمواری پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، ان پر مناسب پابندی عائد کرسکتی ہے۔ کنزالعمال میں روایت منقول ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ بازار میں آئے تو دیکھا کہ ایک شخص کوئی چیز اس کے معروف نرخ سے بہت کم داموں میں فروخت کررہا ہے، آپ نے اس سے فرمایا کہ:-

إما ان تزيد في السعر، وإما ترفع عن سوقي.

ترجمہ:- یا تو دام میں اضافہ کرو، ورنہ ہمارے بازار سے اُٹھ جاؤ۔

روایت میں یہ بات واضح نہیں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کس وجہ سے اس پر پابندی لگائی، ہوسکتا ہے کہ وجہ یہ ہو کہ وہ متوازن قیمت سے بہت کم قیمت لگاکر دُوسرے تاجروں کے لئے جائز نفع کا راستہ بند کر رہا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ پابندی کی وجہ یہ ہو کہ کم قیمت پر مہیا ہونے کی صورت میں لوگ اسے ضرورت سے زیادہ خرید رہے ہوں، جس سے اِسراف کا دروازہ کھلتا ہو، یا لوگوں کے لئے ذخیرہ اندوزی کی گنجائش نکلتی ہو۔ بہرصورت قابلِ غور بات یہ ہے کہ اصل شرعی حکم یہ ہے کہ ایک شخص اپنی ملکیت کی چیز جس دام پر چاہے فروخت کرسکتا ہے، لہٰذا کم قیمت پر بیچنا فی نفسہ جائز تھا، لیکن کسی اجتماعی مصلحت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر پابندی عائد کی۔

اس قسم کی ریاستی پابندیوں کے واجب التعمیل ہونے کا ماخذ قرآنِ کریم کا یہ ارشاد ہے:-

يَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَأَطِيعُوا۟ ٱلرَّسُولَ وَأُو۟لِى ٱلْأَمْرِ مِنكُمْ.

ترجمہ:- اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اور

اپنے میں سے بااِختیار لوگوں کی اطاعت کرو۔

اس آیت میں "اُولِی الْاَمْرِ" (بااِختیار اَفراد) کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت سے الگ کرکے ذکر کیا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ جن چیزوں میں قرآن وسنت نے کوئی معین حکم نہیں دیا، ان میں اُولی الامر کے اَحکام واجب التعمیل ہیں۔

یہاں یہ بات واضح رہنا ضروری ہے کہ حکومت کو مباحات پر پابندی عائد کرنے کا یہ اختیار غیر محدود نہیں ہے، بلکہ اس کے بھی کچھ اُصول وضوابط ہیں، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، لیکن دو باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت کا وہی حکم واجب التعمیل ہے جو قرآن وسنت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو، اور دُوسرے یہ کہ حکومت کو اس قسم کی پابندی عائد کرنے کا اختیار صرف اس وقت ملتا ہے جب کوئی اجتماعی مصلحت اس کی داعی ہو۔ چنانچہ ایک مشہور فقہی قاعدے میں اس بات کو اس طرح تعبیر کیا گیا ہے کہ:-

تصرّف الامام بالرعیة منوط بالمصلحة.

ترجمہ:- عوام پر حکومت کے اختیارات مصلحت کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔

لہٰذا اگر کوئی حکومت کسی اجتماعی مصلحت کے بغیر کوئی پابندی عائد کرے تو یہ پابندی جائز نہیں، اور قاضی کی عدالت سے اس کو منسوخ کرایا جاسکتا ہے۔

۳- اخلاقی پابندیاں

جیسا کہ پیچھے عرض کیا گیا کہ اسلام ٹھیٹ معنوں میں کسی معاشی نظام کا نام نہیں بلکہ ایک دِین کا نام ہے، اس دِین کی تعلیمات اور اَحکام زندگی کے دُوسرے شعبوں کی طرح معیشت سے بھی متعلق ضرور ہیں۔ لیکن اس دِین کی تعلیمات میں یہ بات قدم قدم پر واضح کی گئی ہے کہ معاشی سرگرمیاں اور ان سے حاصل ہونے والے مادّی فوائد اِنسان کی زندگی کا منتہائے مقصود نہیں ہے۔ قرآن وسنت کا تمام تر زور اس بات پر ہے کہ دُنیاوی زندگی ایک محدود اور چند روزہ زندگی ہے اور اس کے بعد ایک

ایسی اَبدی زندگی آنے والی ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں، اور اِنسان کا اصل کام یہ ہے کہ وہ اپنی دُنیوی زندگی کو اس آخرت کی زندگی کے لئے زینہ بنائے، اور وہاں کی بہبود کی فکر کرے۔ لہٰذا اِنسان کی اصل کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ دُوسروں کے مقابلے میں چار پیسے زیادہ کمالے، بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ آخرت کی ابدی زندگی میں زیادہ سے زیادہ عیش و آرام کا انتظام کرے، جس کا راستہ یہ ہے کہ دُنیا میں رہتے ہوئے وہ کام کرے جو اس کے لئے زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہو۔

جب یہ ذہنیت افراد میں پیدا ہوجاتی ہے تو ان کے معاشی فیصلوں پر اَثر انداز ہونے والی چیز صرف یہ نہیں ہوتی کہ کونسی صورت میں ہماری تجوری زیادہ بھرے گی، بلکہ بسا اوقات ان کے معاشی فیصلے اس بنیاد پر بھی ہوتے ہیں کہ کون سے کام میں مجھے آخرت میں زیادہ فائدہ حاصل ہوگا؟ اس طرح بہت سے معاملات میں شریعت نے کوئی وجوبی حکم (Mandatory Order) تو نہیں دیا، لیکن کسی خاص بات کے اُخروی فضائل بیان فرمائے ہیں جو ایک مؤمن کے لئے بہت بڑی کشش کا ذریعہ ہیں، اور ان کے توسط سے انسان خود اپنے اُوپر بہت سی پابندیاں عائد کرلیتا ہے۔ اخلاقی پابندیوں سے میری مراد اسی قسم کی پابندیاں ہیں۔

اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس سرمایہ کاری کے لئے دو راستے ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنا سرمایہ کسی جائز تفریحی مگر تجارتی منصوبے میں لگائے، جس میں اسے زیادہ آمدنی کی توقع ہو۔ اور دُوسرا یہ کہ وہ یہ سرمایہ بے گھر لوگوں کے لئے سستے مکان تعمیر کرکے فروخت کرنے پر صَرف کرے، جس میں اسے نسبتاً کم منافع کی توقع ہے۔ تو ایک سیکولر ذہنیت کا حامل شخص یقیناً پہلے راستے کو اِختیار کرے گا، کیونکہ اس میں منافع زیادہ ہے، لیکن جس شخص کے دِل میں آخرت کی فکر بسی ہوئی ہو، وہ اس کے برعکس یہ سوچے گا کہ اگرچہ رہائشی منصوبے میں مالی نفع نسبتاً کم ہے، لیکن میں غریب لوگوں کے لئے رہائشی مکان فراہم کرکے اپنے لئے آخرت میں اجر و ثواب زیادہ حاصل کرسکتا ہوں، اس لئے مجھے تفریحی منصوبے کے بجائے رہائشی منصوبے کو اِختیار کرنا چاہئے۔

یہاں اگرچہ دونوں راستے شرعی اعتبار سے جائز تھے، اور ان میں سے کسی پر کوئی ریاستی پابندی بھی عائد نہیں تھی، لیکن عقیدۂ آخرت پر مبنی اخلاقی پابندی نے لوگوں کی ضرورت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس شخص کے دِل میں ایک اندرونی رُکاوٹ پیدا کردی، جس سے ترجیحات کا بہتر تعین اور وسائل کی بہتر تخصیص عمل میں آئی۔ یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے، لیکن اگر واقعتاً اسلام کا عقیدۂ آخرت دِل میں پوری طرح جاگزیں اور مستحضر ہوتو وہ معاشی فیصلوں کی بہتری میں بہت زبردست کردار اَدا کرتا ہے۔

مجھے اس سے انکار نہیں کہ غیر اِسلامی معاشروں میں بھی اخلاق کا ایک مقام ہے، اور بعض مرتبہ اخلاقی نقطۂ نظر معاشی فیصلوں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، لیکن چونکہ ان اخلاقی تصوّرات کی پشت پر آخرت کا مضبوط عقیدہ نہیں، اس لئے وہ بحیثیت مجموعی معیشت کے اُوپر کوئی بہت نمایاں اثرات نہیں چھوڑتا۔ اس کے برخلاف اسلام اپنی تمام تعلیمات کے ساتھ بتمام وکمال نافذ العمل ہوتو اس کی اخلاقی تعلیمات کا اثر معیشت پر بہت نمایاں ہوگا، جیسا کہ ماضی میں اس کی بے شمار جیتی جاگتی مثالیں سامنے آچکی ہیں۔ لہٰذا اخلاقی پابندیوں کا یہ عنصر ٹھیٹ اسلامی معیشت کے تناظر میں کسی بھی طرح کوئی کمزور عنصر نہیں، بلکہ اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

مختلف نظامہائے معیشت میں دولت کی پیدائش اور تقسیم

اب تک جو بحث کی گئی، وہ معیشت کے بارے میں بنیادی نظریاتی بحث تھی۔ اب میں مختصراً اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ مختلف نظامہائے معیشت کے جو بنیادی نظریات پیچھے بیان کئے گئے، ان پر عمل کرنے کے لئے ہر نظامِ معیشت کیا طریقِ کار اِختیار کرتا ہے؟ اس طریقِ کار کو عموماً علمِ معاشیات میں چار عنوانات کے تحت بیان کیا جاتا ہے:-

۱- پیدائشِ دولت (Production of Wealth)

اس عنوان کے تحت ان مسائل سے بحث ہوتی ہے جو دولت کی پیداوار سے متعلق ہیں، یعنی یہ بتایا جاتا ہے کہ ہر نظامِ معیشت کے تحت پیداوار حاصل کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جاتے ہیں؟ اس میں افراد، اداروں اور حکومت وغیرہ کا کیا کردار ہوتا ہے؟ اس عنوان کا عربی نام "إنتاج الثروة" ہے۔

۲- تقسیمِ دولت (Distribution of Wealth)

اس عنوان کے تحت اس بات سے بحث ہوتی ہے کہ حاصل شدہ پیداوار کو اس کے مستحقین کے درمیان کس طریقِ کار کے تحت تقسیم کیا جائے؟ اس کو عربی میں "توزیع الثروة" کہتے ہیں۔

۳- مبادلۂ دولت (Exchange of Wealth)

اس عنوان کے تحت ان طریقوں سے بحث کی جاتی ہے جو لوگ ایک چیز کے بدلے دُوسری چیز حاصل کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں، اس عنوان کو عربی زبان میں "مبادلة الثروة" کہتے ہیں۔

۴- صَرفِ دولت (Consumption of Wealth)

اس عنوان کے تحت حاصل شدہ پیداوار یا دولت کو خرچ کرنے سے متعلق مسائل سے بحث ہوتی ہے، اس کو عربی میں "إستهلاک الثروة" کہا جاتا ہے۔

جہاں تک "مبادلۂ دولت" اور "صَرفِ دولت" کا تعلق ہے، میں فی الحال ان عنوانات کو نظر انداز کرتا ہوں، ان سے متعلق بعض اہم مسائل اگلے مباحث کے ضمن میں ان شاء اللہ آجائیں گے۔ البتہ پیدائشِ دولت اور تقسیمِ دولت کے بارے میں چند بنیادی باتیں اِشتراکیت، سرمایہ داری اور اِسلام کے تقابلی مطالعے کے لئے ضروری ہیں، ان کو مختصراً بیان کرنا پیشِ نظر ہے۔

پیدائش اور تقسیم کا سرمایہ دارانہ نظریہ

سرمایہ دارانہ نظام میں یہ بات ایک مُسلَّمہ کے طور پر طے شدہ ہے کہ کسی بھی چیز کی پیداوار میں چار عوامل کارفرما ہوتے ہیں، جن کو اُردو میں ''عواملِ پیداوار'' اور عربی میں ''عوامل الإنتاج'' اور انگریزی میں "Factors of Production" کہتے ہیں۔

۱- زمین (Land)

اس سے مراد قدرتی عاملِ پیدائش ہے، جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے، اور اس کے پیدا کرنے میں کسی انسانی عمل کا کوئی دخل نہیں۔

۲- محنت (Labour)

اس سے مراد وہ انسانی عمل ہے جس کے ذریعے کوئی نئی پیداوار وجود میں آتی ہے۔

۳- سرمایہ (Capital)

اس کی تعریف سرمایہ دارانہ نظام میں یہ کی گئی ہے کہ سرمایہ ''پیدا کردہ عاملِ پیدائش'' (Produced Factor of Production) کا نام ہے۔ اس تعریف کو ذرا وضاحت کے ساتھ یوں کہا جاسکتا ہے کہ سرمایہ وہ عاملِ پیداوار ہے جو قدرتی نہ ہو، بلکہ کسی عملِ پیدائش کے نتیجے میں پیدا ہو، اور اس کے بعد کسی اگلے عملِ پیدائش میں استعمال ہو رہا ہو۔

۴- آجر (Enterpreneur)

اس سے مراد وہ شخص یا ادارہ ہے جو کسی عملِ پیدائش کا محرک ہوتا ہے، اور مذکورہ بالا تین عواملِ پیداوار کو جمع کرکے انہیں پیدائش کے عمل میں استعمال کرتا ہے اور نفع ونقصان کا خطرہ مول لیتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں پیدائش کا عمل ان چار عوامل کی مشترک کارروائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ عوامل ایک ہی شخص کی ذات میں بھی جمع ہوجاتے ہیں، یعنی وہی زمین فراہم کرتا ہے، وہی

محنت کرتا ہے، اور وہی سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ لیکن بڑے پیمانے کی صنعتوں میں عموماً یہ چاروں عوامل الگ الگ شخصیتوں میں ظاہر ہوتے ہیں، اور چونکہ پیداوار ان کے اشتراک سے عمل میں آتی ہے، لہٰذا حاصل شدہ پیداوار کے مستحق بھی یہی ہیں۔ چنانچہ تقسیمِ دولت کا سرمایہ دارانہ نظریہ یہ ہے کہ زمین کو لگان یا کرایہ (Rent) ملنا چاہئے، محنت کو اُجرت (Wages)، سرمائے کو سود (Interest) اور آجر کو نفع (Profit)۔ ان میں سے تقسیم کی پہلی تین مدّات یعنی کرایہ، اُجرت اور سود پہلے سے متعین ہوتی ہیں، اور ان کا تعین رسد وطلب کی بنیاد پر ہوتا ہے، جس کی تشریح پیچھے گزر چکی ہے، البتہ تقسیم کی چوتھی مد یعنی منافع، کاروبار شروع کرتے وقت متعین طور سے معلوم نہیں ہوتا، بلکہ اس کا تعین کاروبار کے نتیجہ خیز ہونے کے بعد ہوتا ہے، یعنی پہلی تین مدّات میں دولت تقسیم کرنے کے بعد جو کچھ بچے، وہ آجر کا منافع ہوتا ہے۔

اِشتراکی نظام میں پیدائش و تقسیم

اِشتراکیت کا کہنا یہ ہے کہ حقیقتاً عواملِ پیداوار چار نہیں، بلکہ صرف دو ہیں۔ ایک زمین، دُوسرے محنت۔ انہی دونوں کے اِشتراک سے پیداوار وجود میں آتی ہے، سرمائے کو اس لئے عاملِ پیداوار نہیں کہہ سکتے کہ وہ خود کسی عملِ پیدائش کا نتیجہ ہوتا ہے، اور آجر کو اس لئے مستقل عاملِ پیداوار قرار دینے کی ضرورت نہیں کہ اس کا عمل محنت میں داخل ہوسکتا ہے۔ دُوسرے خطرہ مول لینے کی صفت کسی شخص یا پرائیویٹ ادارے میں تسلیم کرنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ یہ کام اِشتراکی نظام میں حکومت کرتی ہے، افراد کو کاروباری مہم جوئی کی نہ اجازت ہے اور نہ ضرورت۔

چونکہ اِشتراکی نظام میں حقیقی عاملِ پیداوار صرف زمین اور محنت ہیں، زمین کسی کی شخصی ملکیت نہیں ہوتی، اس لئے اس کو الگ سے معاوضہ دینے کی ضرورت نہیں، لہٰذا تقسیمِ دولت کی صرف ایک مد رہ جاتی ہے، اور وہ ہے اُجرت، جس کا تعین سرکاری منصوبہ بندی کے تحت ہوتا ہے۔ کارل مارکس کا مشہور نظریہ ہے کہ کسی چیز کی قدر میں اضافہ صرف محنت سے ہوتا ہے، اس لئے اُجرت کا اِستحقاق صرف محنت کو ہے،

سرمائے کا سود، زمین کا لگان اور آجر کا نفع ایک فالتو چیز ہے، جسے مصنوعی طور پر پیدا کیا گیا ہے۔ اس نظریے کو "قدرِ زائد کا نظریہ" (Theory of Surplus Value) کہا جاتا ہے، اور اس کا عربی نام "نظرية القدر" ہے۔

اِسلامی تعلیمات

قرآن وسنت میں پیدائشِ دولت اور تقسیمِ دولت پر اس انداز سے تو گفتگو نہیں کی گئی، جس طرح کسی معاشیات کی کتاب میں کی جاتی ہے، لیکن معیشت کے مختلف ابواب میں قرآن وسنت نے جو اَحکام عطا فرمائے ہیں، ان پر غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اسلام میں سرمایہ (Capital) اور آجر (Enterpreneur) کی تفریق کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کاروبار کے نفع ونقصان کا خطرہ آجر پر ڈالا گیا ہے اور سرمائے کو معین شرح سے سود دیا جاتا ہے۔ اسلام میں چونکہ سود حرام ہے، اس لئے نفع ونقصان کا خطرہ خود سرمایہ دار پر عائد ہوتا ہے، لہٰذا ہر وہ شخص جو کسی کاروبار میں سرمایہ کاری کر رہا ہو، اسے نفع کی اُمید کے ساتھ نقصان کا خطرہ بھی مول لینا پڑے گا۔ اس طرح یا تو یوں کہا جائے کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے اگرچہ سرمایہ اور آجر الگ الگ عاملِ پیدائش ہیں لیکن سرمایہ فراہم کرنے والا ہر فرد چونکہ خطرہ بھی مول لیتا ہے، اس لئے وہ جزوی یا کلی طور پر آجر بھی ہے، اور تقسیمِ دولت میں سرمائے اور آجر دونوں کا صلہ منافع ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ سرمایہ اور آجر دو الگ الگ عاملِ پیداوار نہیں، بلکہ یہ ایک ہی عامل ہے اور تقسیمِ دولت میں اس کو منافع ملتا ہے۔ بہرصورت جس طرح زمین کو معین کرایہ اور محنت کو معین اُجرت دی جاتی ہے، اس طرح سرمائے کو معین سود نہیں دیا جاسکتا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کو زمین پر قیاس کیا جاتا ہے کہ جس طرح زمین فراہم کرکے ایک شخص معین کرایہ وصول کرسکتا ہے، اسی طرح سرمایہ فراہم کرکے معین سود بھی وصول کرسکتا ہے، لیکن اسلامی اَحکام کی رُو سے قیاس دُرست نہیں، صورتِ حال یہ ہے کہ زمین اور سرمائے میں مندرجہ ذیل تین وجوہ سے زبردست فرق پایا جاتا ہے:-

۱- زمین بذاتِ خود ایک قابلِ اِنتفاع چیز ہے، اس سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اسے خرچ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے اسے عاملِ پیدائش کے طور پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، اور اس سے دُوسرے فوائد بھی حاصل کئے جاسکتے ہیں، لہٰذا اس کا کرایہ درحقیقت ان فوائد کا معاوضہ ہے جو زمین براہِ راست دے رہی ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ یعنی روپیہ ایسی چیز ہے جو بذاتِ خود قابلِ اِنتفاع نہیں، وہ اس وقت تک انسان کو فائدہ نہیں پہنچاتا جب تک اسے خرچ کرکے اس کے بدلے کوئی قابلِ اِنتفاع چیز خرید نہ لی جائے، لہٰذا جس نے کسی کو روپیہ فراہم کیا، اس نے کوئی ایسی چیز فراہم نہیں کی جو براہِ راست قابلِ اِنتفاع ہو، لہٰذا اس پر کرایہ وصول کرنے کا سوال نہیں، کیونکہ کرایہ اس چیز کا ہوتا ہے جس سے اس کا وجود برقرار رکھتے ہوئے فائدہ اُٹھایا جائے۔

۲- زمین، مشینری، آلات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں کہ ان کے استعمال سے ان کی قدر میں کمی ہوتی ہے، اسی لئے ان چیزوں کو جتنا زیادہ استعمال کیا جائے گا، ان کی قدر اتنی ہی گھٹتی جائے گی، لہٰذا ان چیزوں کا جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے اس میں قدر کے نقصان کی تلافی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف روپیہ ایسی چیز ہے کہ محض استعمال سے اس کی قدر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

۳- اگر کوئی شخص کوئی زمین، مشینری یا سواری کرایہ پر لیتا ہے تو یہ چیزیں اس کے ضمان (Risk) میں نہیں ہوتیں، بلکہ اصل مالک کے ضمان میں رہتی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں کرایہ دار کی کسی غفلت یا زیادتی کے بغیر کسی سماوی آفت کے نتیجے میں تباہ ہوجائیں یا چوری ہوجائیں تو نقصان کرایہ دار کا نہیں، بلکہ اصل مالک کا ہوگا، اور چونکہ اصل مالک ان کی تباہی کا خطرہ برداشت کر رہا ہے اور کرایہ دار کو اس خطرے سے آزاد کرکے اپنی ملکیت کے استعمال کا حق دے رہا ہے، اس لئے وہ ایک معین کرایہ کا بجا طور پر حق دار ہے۔ اس کے برعکس جو شخص کسی کو روپیہ قرض دے رہا ہے، وہ روپیہ اس کے ضمان (Risk) میں نہیں رہتا، بلکہ قرض دار کے ضمان میں چلا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ قرض دار کے قبضے میں جانے کے

بعد اگر وہ روپیہ کسی سماوی آفت سے تباہ ہوجائے، یا چوری ہوجائے تو نقصان قرض دینے والے کا نہیں، قرض لینے والے کا ہے۔ یعنی قرض دار شخص اس صورت میں بھی اتنا روپیہ قرض خواہ پر لوٹانے کا ذمہ دار اور پابند ہے، اور چونکہ قرض دینے والے نے قرض دے کر اس روپیہ کا کوئی خطرہ مول نہیں لیا، اس لئے وہ اس پر کسی معاوضے کا حق دار نہیں۔

اس تشریح کی روشنی میں تقسیم دولت کے اسلامی اُصول کا سرمایہ دارانہ اُصول سے ایک بنیادی فرق تو یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں سرمائے کو معین شرح سے سود دیا جاتا ہے، جبکہ اسلام میں سرمائے کا حق منافع ہے، جو اسے اسی وقت ملے گا جب وہ نقصان کا خطرہ بھی برداشت کرے، یعنی کاروبار کے نفع ونقصان دونوں میں شریک ہو، جس کا طریقہ شرکت یا مضاربت ہے۔

اور دُوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ سرمایہ داری ہو، یا اِشتراکیت، دونوں نظاموں میں دولت کا اِستحقاق صرف ان عاملینِ پیدائش کی حد تک محدود رکھا گیا ہے، جنھوں نے عملِ پیدائش میں ظاہری طور پر براہِ راست حصہ لیا۔ لیکن اسلام کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر چیز پر حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور ہر چیز کی پیدائش کا اصل کارنامہ اللہ تعالیٰ ہی انجام دیتے ہیں، جن کی توفیق کے بغیر کوئی عاملِ پیدائش ایک ذرّہ بھی وجود میں نہیں لاسکتا، لہٰذا کوئی بھی عاملِ پیدائش بذاتہٖ آمدنی کا مالک اور مستحق نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو مستحق قرار دیں گے وہی مستحق ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ آمدنی کا اوّلین مستحق تو عواملِ پیدائش ہی کو قرار دیا ہے، لیکن دولت کے ثانوی مستحقین کی ایک طویل فہرست رکھی ہے، جو پیدا شدہ دولت میں اسی طرح حق دار ہیں جس طرح خود عواملِ پیدائش۔ یہ ثانوی مستحقین معاشرے کے وہ افراد ہیں جو اگرچہ قلتِ وسائل کی وجہ سے اس عملِ پیدائش میں براہِ راست حصہ نہیں لے سکے، لیکن اسی انسانی معاشرے کا فرد ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی دولت میں ان کا بھی حصہ ہے۔ ان ثانوی مستحقین تک دولت پہنچانے کے لئے اسلام نے زکوٰۃ، عشر، صدقات، خراج، کفارات، قربانی اور وراثت کے اَحکام دیئے ہیں، جن کے ذریعے

دولت کا ایک بڑا حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچ جاتا ہے۔ دولت کے اوّلین مستحق یعنی عوامل پیداوار، آمدنی خواہ کرائے کی صورت میں حاصل ہوئی ہو یا اُجرت کی صورت میں یا منافع کی صورت میں، ان میں سے ہر شخص اس بات کا پابند ہے کہ وہ اپنی آمدنی میں سے ایک معتد بہ حصہ ان ثانوی مستحقین تک پہنچائے اور یہ اس کی طرف سے کوئی احسان نہیں، بلکہ اس کے ذمے ان کا حق ہے، چنانچہ قرآنِ کریم نے ارشاد فرمایا:-

وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ. لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.

ترجمہ:- اور ان کے مالوں میں محتاج اور محروم کا معین حق ہے۔

اسی طرح زرعی پیداوار کے بارے میں ارشاد فرمایا:-

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ.

ترجمہ:- اور کھیتی کٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔

پیدائشِ دولت پر تینوں نظاموں کے مجموعی اثرات

یہ تھا اشتراکیت، سرمایہ داری اور اِسلام کی معاشی تعلیمات کا ایک مختصر تعارف۔ تینوں نظاموں میں معیشت پر مجموعی حیثیت سے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ یہ ایک بہت طویل الذیل موضوع ہے، جس کی طرف یہاں محض اشارہ ہی کیا جاسکتا ہے، جہاں تک پیدائشِ دولت کا تعلق ہے، تو پیچھے یہ بتایا جاچکا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کو بالکل آزاد چھوڑنے کے نتیجے میں کیا خرابیاں پیدا ہوئیں؟ یہ خرابیاں معاشی بھی ہیں اور اَخلاقی بھی۔ اِشتراکیت نے ذاتی منافع کے محرک کو بالکل ختم کردیا، جس کے نتیجے میں پیداوار کی کمیت (Quantity) اور کیفیت (Quality) دونوں میں کمی آئی، کیونکہ اِشتراکیت میں ہر کام کرنے والے کو طے شدہ اُجرت ہی ملتی ہے تو اس کو اس کام سے ذاتی دلچسپی نہیں ہوتی جو اسے کارکردگی بہتر بنانے پر آمادہ کرتی، اس کا تھوڑا سا اندازہ آپ اس بات سے کرسکتے ہیں کہ پاکستان میں بھی ایک مرتبہ مختلف صنعتوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا تھا، اور یہ اسی اِشتراکی

پروپیگنڈے کا نتیجہ تھا۔ سالہا سال کے تجربے کے بعد قومی ملکیت میں لئے گئے ادارے مسلسل انحطاط پذیر رہے، جس کے نتیجے میں بالآخر اَب انہیں دوبارہ ذاتی ملکیت میں دیا جارہا ہے، جس کے لئے آج کل نج کاری (Privatization) کی اِصطلاح استعمال ہورہی ہے۔

یہی حال رُوس میں ہوا کہ پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اتنا نقصان آیا کہ ملک دیوالیہ ہونے کے قریب ہوگیا، سوویت یونین تو بعد میں شکست و ریخت کا شکار ہوا، لیکن اس سے کئی سال پہلے جب سوویت یونین کے حکمران کمیونزم کو سنبھالا دینے کی کوشش کر رہے تھے، اس وقت سوویت یونین کے صدر میخائل گورباچوف نے ملک کی تعمیرِنو کا پروگرام اپنی کتاب پیرس ٹرائیکا (Perestroica) میں پیش کیا تھا، اس کتاب میں اس نے کمیونزم کی براہِ راست تردید نہیں کی تھی، لیکن اس بات پر زور دیا کہ اِشتراکیت کی نئی تشریح کی ضرورت ہے اور اس نئی تشریح میں اس بات کا بار بار اِعتراف کیا کہ اب ہمیں اپنی معیشت ازسرِنو تعمیر کرنے کے لئے بازار کی قوتوں (Market Forces) سے ضرور کام لینا پڑے گا۔

اسلام نے ایک طرف ذاتی منافع کے محرک کو تسلیم کیا، جو پیداوار کی کمیت اور کیفیت میں اضافے کا موجب ہوتا ہے، لیکن دُوسری طرف اس پر وہ پابندیاں عائد کردیں جو اسے ان معاشی اور اَخلاقی خرابیوں سے باز رکھ سکے، جو سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ دارانہ نظام میں سود کی اجازت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کرنے والا کاروبار کی بہبود سے قطعی لاتعلق رہتا ہے، اس کو اس سے غرض نہیں ہوتی کہ کاروبار کو فائدہ ہوا یا نقصان، کیونکہ اس کو ہر صورت میں معین شرح سے سود ملنا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام میں چونکہ سود حرام ہے، اس لئے کسی کاروبار کو سرمایہ فراہم کرنے (Financing) کی بنیاد شرکت اور مضاربت پر ہی ہوسکتی ہے، اس صورت میں سرمایہ فراہم کرنے والے کی پوری خواہش اور کوشش یہ ہوگی کہ جس کاروبار میں اس نے سرمایہ لگایا ہے، وہ ترقی کرے، اور اسے نفع حاصل ہو، ظاہر ہے کہ اس سے پیدائشِ دولت پر بہتر اَثرات قائم ہوں گے۔

تقسیمِ دولت پر تینوں نظاموں کے اثرات

جہاں تک تقسیمِ دولت کا تعلق ہے، اشتراکیت نے ابتداءً یہ دعویٰ کیا تھا کہ منصوبہ بند معیشت میں آمدنی کی مساوات قائم ہوگی، جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام افراد کو برابر آمدنی ملے، لیکن یہ محض ایک نظریاتی خواب تھا اور بعد میں نہ صرف یہ کہ عملاً کبھی مساوات قائم نہیں ہوئی، بلکہ نظریاتی طور پر بھی مساوات کا دعویٰ واپس لے لیا گیا۔ اور وہاں بھی اُجرتوں کے درمیان شدید تفاوت قائم ہوا۔ چونکہ اُجرتوں کا تعین تمام تر حکومت کرتی تھی، اس لئے اس تعین میں ایک عام مزدور کو کوئی دخل نہیں تھا، اور اگر اس کو اُجرت کا یہ تعین غیر منصفانہ محسوس ہو تو اس کے خلاف چارہ جوئی کی بھی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام میں کم از کم یہ ہوتا ہے کہ اگر مزدور اپنی اُجرت بڑھوانا چاہیں تو اس کے لئے نہ صرف یہ کہ آواز بلند کر سکتے ہیں بلکہ احتجاج کے دوسرے ذرائع مثلاً ہڑتال وغیرہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ لیکن اشتراکی نظامِ سیاست میں اس قسم کی آواز بلند کرنے یا احتجاج کے ذرائع اختیار کرنے کی بھی کوئی گنجائش نہیں، اس لئے عملاً اشتراکی نظام میں مزدور کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا، بلکہ آخر میں نتیجہ یہی نکلا کہ اشتراکی ممالک کے محنت کشوں کا معیارِ زندگی سرمایہ دارانہ نظام کے مزدور سے بھی کم تر رہا، اور بالآخر لوگوں نے تنگ آکر پھر اسی سرمایہ دارانہ نظام کا خیر مقدم کیا، جس سے وہ نکل کر بھاگے تھے۔ یہ نتائج ان ملکوں میں زیادہ واضح طور پر مشاہدے میں آئے جہاں ایک ہی ملک کا کچھ حصہ اشتراکیت کے زیرِ اَثر تھا اور دُوسرا حصہ سرمایہ دارانہ نظام کے زیرِ اَثر تھا۔ مثلاً مشرقی اور مغربی جرمنی، مغربی جرمنی ترقی کرتا ہوا کہیں سے کہیں پہنچ گیا، اور مشرقی جرمنی اس کے مقابلے میں بہت پیچھے رہا، وہاں کے مزدوروں کی حالت بھی مغربی جرمنی کے مقابلے میں پس ماندہ رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے تنگ آکر دیوارِ برلن توڑ دی، اور اشتراکیت کی ناکامی کا عملاً اعتراف کرلیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں تقسیمِ دولت واقعتاً منصفانہ تھی، واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی جن خرابیوں کے رَدِّعمل کے طور پر

اِشتراکیت وجود میں آئی تھی وہ بڑی حد تک اب بھی برقرار ہیں۔ ذاتی منافع کے محرک کو بے لگام چھوڑنے سے اجارہ داریاں اب بھی وجود میں آتی ہیں۔ سود، قمار اور سٹے کا بازار اَب بھی گرم ہے، جس کے نتیجے میں ہزارہا عوام کی دولت کھنچ کھنچ کر چند اَفراد کے ہاتھوں میں سمٹتی رہتی ہے، اور عوام کے سفلی جذبات کو برانگیختہ کرکے ان سے پیسے کھینچنے کا عمل اب بھی جاری ہے، بہت سے سرمایہ دار ممالک میں ایسے لاکھوں افراد اب بھی موجود ہیں جن کے پاس سر چھپانے کو گھر نہیں، اور سردیوں کی راتوں میں زیرِ زمین ریلوے اسٹیشنوں میں پناہ لیتے ہیں۔

اس صورتِ حال کی بہت بڑی ذمہ داری سود، قمار اور سٹے پر عائد ہوتی ہے، قمار اور سٹے میں تو یہ بات واضح ہے کہ ان کے ذریعے بہت سے افراد کا سرمایہ کھنچ کھنچ کر کسی ایک شخص کی جیب پر مُن برسا دیتا ہے، لیکن سود کے نتیجے میں تقسیمِ دولت میں جو ناہمواری پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف عام طور سے توجہ نہیں دی جاتی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سود بہرصورت تقسیمِ دولت کے توازن میں بگاڑ پیدا کرتا ہے، کیونکہ جو شخص کسی دُوسرے سے قرض لے کر کاروبار کرتا ہے، اگر اسے کاروبار میں نقصان ہو تو قرض دینے والا بہرصورت اپنے سود کا مطالبہ جاری رکھتا ہے، بلکہ سود در سود ہوکر اس کی واجب الادا رقم کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے، اس طرح قرض لینے والا سراسر نقصان میں ہے اور قرض دینے والا سراسر فائدے میں۔ دُوسری طرف جو بڑے سرمایہ دار بینکوں سے بھاری رقمیں لے کر بڑے پیمانے پر کاروبار کرتے ہیں، ان کو اپنے اس کاروبار میں بھاری نفع ہوتا ہے، اس کا وہ بہت تھوڑا حصہ سود کی شکل میں بینک کو اور بینک کے واسطے سے امانت دار عوام کو منتقل کرتے ہیں، باقی سارا نفع خود رکھتے ہیں اور اس طرح دونوں صورتوں میں تقسیمِ دولت غیر متوازن ہوتی ہے۔

اس کو ایک سادہ سی مثال سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص نے اپنی جیب سے صرف دس لاکھ روپے کسی کاروبار میں لگائے اور نوّے لاکھ روپے بینک سے قرض لے لئے، اور اس طرح ایک کروڑ روپے سے تجارت کی، جب اتنی بھاری رقم سے تجارت کی جائے گی تو اس پر نفع کی

شرح بھی بہت زیادہ ہوگی، فرض کیجئے کہ کاروبار میں پچاس فیصد نفع ہوا، اور ایک کروڑ کے ڈیڑھ کروڑ بن گئے، تو یہ سرمایہ دار پچاس لاکھ کے نفع سے صرف پندرہ لاکھ روپے سود کے طور پر بینک کو دے گا، جس میں سے بینک اپنا نفع رکھ کر بمشکل دس یا بارہ لاکھ روپے ان سینکڑوں عوام میں تقسیم کرے گا جن کی امانتیں اس کے پاس جمع ہیں، جس کا خالص نتیجہ یہ ہے کہ اس کاروبار میں جن سینکڑوں افراد نے نوّے لاکھ روپے کا سرمایہ لگایا تھا، اور انہی کے سرمایہ نے درحقیقت اتنے بھاری نفع کو ممکن بنایا، ان میں تو کل دس بارہ لاکھ روپے تقسیم ہوئے، اور جس سرمایہ دار نے کل دس لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی تھی، اسے کاروبار کے نفع کی صورت میں پینتیس لاکھ روپے ملے۔ پھر دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پندرہ لاکھ روپے جو بینک کو دیئے گئے اور بینک کے واسطے سے عوام تک پہنچے، ان کو سرمایہ دار اپنی مصنوعات کی لاگت میں شامل کرتا ہے، اور جو بالآخر اس کی جیب پر نہیں پڑتے، بلکہ عام صارفین کی جیب پر پڑتے ہیں، کیونکہ اس کاروبار میں اس نے جو مصنوعات تیار کیں ان کی قیمت مقرر کرتے وقت بینک کو دیئے ہوئے سود کی رقم بھی قیمت میں شامل کرتا ہے اور اس طرح درحقیقت اس کی اپنی جیب سے کچھ خرچ نہیں ہوا، اور اگر کاروبار میں کسی سماوی آفت یا کسی حادثے وغیرہ کی وجہ سے نقصان ہونے لگے تو اس نقصان کی تلافی انشورنس کمپنی کے ذریعے کرالی جاتی ہے اور اس انشورنس کمپنی میں بھی ان ہزارہا عوام کا پیسہ جمع رہتا ہے جو ماہ بہ ماہ یا سال بہ سال اپنی کمائی کا ایک حصہ یہاں جمع کراتے رہتے ہیں، لیکن نہ ان کے کسی تجارتی مرکز کو آگ لگتی ہے اور نہ کوئی اور حادثہ پیش آتا ہے، اس لئے عموماً پیسے جمع ہی کراتے ہیں، نکلوانے کی نوبت کم آتی ہے۔

دُوسری طرف اگر اس قسم کے بہت سے سرمایہ دار کسی بھاری نقصان کی وجہ سے بینک کو قرضے واپس نہ کرسکیں، اور اس کے نتیجے میں بینک دیوالیہ ہوجائے، تو اس صورت میں ان سرمایہ داروں کی تو بہت کم رقم گئی، نقصان سارا ان امانت داروں کا ہوا جن کے پیسے کے بل سرمایہ دار کاروبار کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ سود کے اس نظام کی وجہ سے پوری قوم کے سرمائے کو چند

بڑے سرمایہ دار اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور اس کے بدلے میں قوم کو بہت تھوڑا سا حصہ واپس کرتے ہیں، اور یہ تھوڑا سا حصہ بھی اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے دوبارہ عام صارفین ہی سے وصول کرلیتے ہیں، اور اپنے نقصان کی تلافی بھی عوام کی بچتوں سے کرتے ہیں، اور اس طرح سود کا مجموعی رُخ اس طرف رہتا ہے کہ عوام کی بچتوں کا کاروباری فائدہ زیادہ تر بڑے سرمایہ داروں کو پہنچے، اور عوام اس سے کم سے کم مستفید ہوں، اس طرح دولت کے بہاؤ کا رُخ ہمیشہ اُوپر کی طرف رہتا ہے۔

افسوس یہ ہے کہ جب سے دُنیا میں صنعتی انقلاب برپا ہوا، اس وقت سے کوئی ملک ایسی مثال پیش نہیں کرسکا، جہاں صنعت اور تجارت کی ترقی کے ساتھ ساتھ اسلام کے معاشی اَحکام بھی پوری طرح نافذ ہوں۔ اس لئے کسی عملی نمونے کے حوالے سے یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل کرنے سے تقسیمِ دولت میں کس طرح توازن پیدا ہوتا ہے۔ لیکن خالص نظریاتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو اس نتیجے تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ اسلامی تعلیمات پر عمل کی صورت میں دولت کی تقسیم سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلے میں کہیں زیادہ متوازن ہوگی۔ اگر ایک حرمتِ سود کے مسئلے ہی کو لے لیا جائے تو اس سے بھی یہ بات واضح ہوسکتی ہے، کیونکہ سود کے ممنوع ہونے کے بعد کسی کاروبار کو سرمائے کی فراہمی نفع نقصان میں شرکت کی بنیاد پر ہی ہوسکتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر روپیہ لینے والے کو نقصان ہوا ہے تو اس میں روپیہ دینے والا بھی شریک ہوگا، اور اگر نفع ہوا ہے تو روپیہ دینے والا اس نفع کے فیصد حصے کا حق دار ہوگا۔ لہٰذا مذکورہ بالا مثال میں اگر سرمایہ دار نے بینک سے نوّے لاکھ روپے لیتے وقت شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر معاملہ کیا ہو اور اس کے اور بینک کے درمیان اگر ساٹھ فیصد اور چالیس فیصد کا تناسب بھی طے ہوا ہو تو پچاس لاکھ کے منافع سے کم از کم بیس لاکھ روپے اسے بینک کو منتقل کرنے پڑیں گے، اور بینک کو دیئے جانے والے نفع کا تعین چونکہ اشیاء کی فروختگی کے بعد ہوگا اس لئے اس کو اشیاء کی لاگت میں شامل کرکے قیمت کے ذریعے عوام سے وصول نہیں کیا جاسکتا۔

پھر جو نفع اس طرح سرمایہ دار کو حاصل ہوگا، اس میں سے بھی زکوٰۃ اور

صدقات وغیرہ کے ذریعے ایک بڑا حصہ وہ غریب عوام کی طرف منتقل کرنے کا پابند اور ذمہ دار ہوگا۔ اس کا واضح نتیجہ یہ ہے کہ دولت کے بہاؤ کا رُخ چند سرمایہ داروں کے بجائے ملک کے عام باشندوں کی طرف ہوگا، اور جن عوام کی بچتوں سے ملک کی صنعت وتجارت فروغ پارہی ہے، اس کے منافع میں وہ زیادہ بہتر شرح سے حصہ دار ہوں گے۔

کاروبار کی مختلف اقسام (بہ لحاظ ملکیت)

(Diffcrent Kinds of Business)

اشتراکی نظام میں چونکہ سارا نظام حکومتی پالیسی کے تحت چلتا ہے، اس لئے اس میں تو انفرادی اور ذاتی نوعیت کے کاروبار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، لہٰذا کاروبار کی اقسام پر یہ گفتگو سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے۔

ملکیت کے لحاظ سے کاروبار کی تین قسمیں ہیں

۱- شخصی کاروبار (Private Proprietorship)

۲- شرکت (Partnership)

۳- کمپنی (Joint Stock Company)

پہلی دو قسموں کا کاروبار اس وقت سے جاری ہے، جب سے انسان کاروبار کر رہا ہے، فقہاء نے بھی ان کی بنیادی تفصیلات اور ان کے اَحکام ذکر کیے ہیں، اور ان کی موجودہ صورت حال ماضی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں، اس لئے یہاں ان کی تفصیلات کا ذکر نہیں ہوگا، البتہ ''کمپنی'' کاروبار کی نئی قسم ہے، جس کا پہلے فقہاء کے دور میں وجود نہ تھا، اس لئے یہاں اس کی تفصیلات ذکر کرنے کی ضرورت ہے۔

کمپنی کا تعارف

کمپنی کے لغوی معنی ''شرکت'' ہیں، اور کبھی ''رُفقائے کار'' کو بھی کہا جاتا ہے، بعض دُکانوں کے نام میں ''فلاں اینڈ کمپنی'' لکھا ہوا ہوتا ہے، اس سے یہ لغوی معنی ہی مراد ہوتے ہیں جس کو عربی میں "فلان وشرکاءہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس سے وہ معاشی اور اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتے جس کا یہاں تعارف کرایا جارہا ہے۔

لیکن جب ''اینڈ'' کے لفظ کے بغیر کسی تجارتی ادارے کے نام میں ''کمپنی'' کا لفظ ہو، مثلاً ''تاج کمپنی'' تو اس سے مراد اِصطلاحی کمپنی ہوتی ہے، اور عموماً اس کے ساتھ ''لمیٹڈ'' کا لفظ بھی ہوتا ہے، جس کی تشریح آگے آئے گی۔

یورپ میں صنعتی انقلاب رُونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانوں وغیرہ کے قائم کرنے کے لئے جب عظیم سرمائے کی ضرورت پڑنے لگی، جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند اَفراد مل کر فراہم نہیں کرسکتے تھے تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کرکے ان سے اجتماعی فائدہ اُٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا۔ اس نظام کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ شرکت میں ہر شریک کی الگ الگ ملکیت متصوّر ہوتی ہے، مگر اس نظام میں کئی افراد کے مجموعے کو ایک شخصِ قانونی قرار دیا جاتا ہے، جس کی وضاحت اِن شاء اللہ آگے آئے گی، اس شخصِ قانونی کو ''کارپوریشن'' کہتے ہیں جس کی ایک قسم کمپنی ہے۔

ابتداءً کمپنیاں عموماً نیم سرکاری ہوتی تھیں، عموماً حکومت کے چارٹر (اِجازت نامے) کے تحت غیرملکی تجارت کے لئے وجود میں آتی تھیں اور انہیں بہت وسیع اختیارات دیئے جاتے تھے۔ بسااوقات ان کو قوانینِ تجارت وضع کرنے کا بھی اختیار ہوتا تھا، سکہ ڈھالنے اور فوج اور پولیس رکھنے کا بھی اختیار ہوتا تھا۔ برِصغیر پر قابض ہونے والی ''ایسٹ اِنڈیا کمپنی'' بھی اسی قسم کی ایک کمپنی تھی۔ اب وسیع اختیارات کے ساتھ ایسی ریاستی کمپنیاں موجود نہیں رہیں، اب صرف تجارتی کمپنیاں ہوتی ہیں جو حکومت کی اجازت سے قائم ہوتی ہیں، کمپنیوں کی تشکیل کی اجازت اور ان کو کنٹرول کرنے کا کام جو اِدارہ کرتا ہے اس کو ہمارے ملک میں ''کارپوریٹ لاء اتھارٹی'' (Corporate Law Authority) کہا جاتا ہے۔ یہ وزارتِ خزانہ کا ذیلی ادارہ ہے۔

کمپنی کی تشکیل

سب سے پہلے ابتدائی مرحلے میں ماہرین کے مشورے سے ایک رپورٹ تیار کی جاتی ہے، جس میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ جو کاروبار شروع کرنا ہے اس کے

اِمکانات کس حد تک ہیں؟ اس کے لئے وسائل اور سرمایہ کتنا درکار ہوگا؟ تجارتی لحاظ سے یہ کاروبار کس حد تک نفع بخش ہے؟ یہ رپورٹ مختلف شعبوں کے ماہرین سے تیار کرائی جاتی ہے، اس کو "**تقریر الإمکانیات**" (Feasibility Report) کہتے ہیں۔

پھر کمپنی کا اِجمالی ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے، جس میں کمپنی کا نام، کاروبار کی نوعیت، مطلوبہ سرمایہ، ڈائریکٹرز، آئندہ کے لئے ان کے عزل ونصب کا طریقۂ کار وغیرہ لکھا جاتا ہے، اس کو "مذکرۃ" (Memorandom) کہتے ہیں۔

پھر کمپنی کے انتظامی ضوابط لکھے جاتے ہیں، جس کو عربی میں "**نظام الجمعیۃ**" یا "**لائحۃ الجمعیۃ**" اور انگریزی میں "Articles of Association" کہتے ہیں۔

میمورنڈم (مذکرۃ) اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن کے ساتھ حکومت کو کمپنی کی اجازت کے لئے درخواست دے دی جاتی ہے، جب وزارتِ خزانہ کے ذیلی ادارے "کارپوریٹ لاء اتھارٹی" (Corporate Law Authority) کی طرف سے اجازت مل گئی تو اَب کمپنی وجود میں آچکی ہے، اور قانون اب اس کو ایک فرضی شخص قرار دیتا ہے جو بیع وشراء کرے گا، مدعی ومدعا علیہ بنے گا، دائن ومدیون ہوگا۔

اس کو "شخصِ قانونی" (Legal Person) یا "Juristic Person" یا "Juridical Person" کہتے ہیں، بعض مرتبہ اس کو "فرضی شخص" (Fictitious Person) بھی کہا جاتا ہے۔

جب کمپنی وجود میں آگئی تو اَب لوگوں کو حصہ دار بننے کی دعوت دینے کے لئے قانوناً ضروری ہے کہ کمپنی کا پورا طریقِ کار اور اس کا ترکیبی ڈھانچہ شائع کرایا جائے تاکہ عوام کو بھی اس کمپنی پر اِعتماد ہوسکے۔ لوگوں کو کمپنی کے بنیادی طریقِ کار اور متعلقہ اُمور سے واقف کرنے کے لئے جو تحریری بیان شائع کیا جاتا ہے، اس کو عربی میں "نشرۃ الإصدار" اور انگریزی اور اُردو میں پراسپکٹس (Prospectus) کہتے ہیں۔

کمپنی کا سرمایہ

حکومت، جب کمپنی کو اِجازت دیتی ہے تو سرمائے کی تحدید کرتی ہے کہ اتنے

سرمائے کے حصے جاری کئے جاسکتے ہیں، یا اتنے سرمائے میں لوگوں کو شرکت کی دعوت دی جاسکتی ہے، اس کو ''منظور شدہ سرمایہ''، ''رأس المال المسموح'' یا ''راس المال المصرح به''، "Authorised Capital" کہتے ہیں۔

اس میں سے سرمائے کی کچھ مقدار مقرر کردی جاتی ہے جو کمپنی جاری کرنے والوں کی طرف سے شامل کیا جائے گا، اس کو "Sponsors Capital" کہتے ہیں۔ پھر حصص جاری کرنے کے بعد عوام یا کمپنی قائم کرنے والوں نے جتنے سرمائے کے حصص لینے کا وعدہ کیا، اس کو ''اشتراک شدہ سرمایہ''(Subscribed Capital) کہا جاتا ہے۔ پھر جن لوگوں نے کمپنی میں اِشتراک(Subscription) کرلیا ہو، اور سرمائے کی ادائیگی ذمے لے لی ہو، ان سے سرمایہ فوری طور پر یکمشت شامل کرنا ضروری نہیں ہوتا، کبھی تدریجاً بھی ادا کرتے رہتے ہیں، چنانچہ سرمائے کا جتنا حصہ ادا کردیا گیا ہو، اس کو ''ادا شدہ سرمایہ''، ''رأس المال المدفوع''، "Paid Up Capital" کہتے ہیں۔

کمپنی جس سرمائے کے شیئرز جاری کر کے لوگوں کو حصے لینے کی دعوت دے، اس سرمائے کو ''جاری کردہ سرمایہ''، ''رأس المال المعروض''، (Issued Capital) کہتے ہیں۔

لوگ فارم پُر کر کے جتنے سرمائے کے حصے خریدنے کا وعدہ کرلیں، اس کو ''اِشتراک کردہ سرمایہ''، ''رأس المال المساهم'' یا ''رأس المال المكتتب''، "Subscribed Capital" کہتے ہیں۔

مثلاً کمپنی کو ۱۰۰ ملین روپے سے کاروبار کی اجازت ملی، تو ۱۰۰ ملین روپے ''منظور شدہ سرمایہ'' ہے، اس میں سے ۲۰ ملین کمپنی قائم کرنے والوں کے ذمے ہے، جس میں سے ۱۰ ملین روپے انہوں نے دے دیئے، یہ سپانسرز کیپٹل کا ''ادا شدہ سرمایہ'' ہے، ۸۰ ملین عوام سے وصول کرنا ہے، جس میں سے فی الحال ۶۰ ملین روپے کے حصے جاری کئے جاتے ہیں، باقی آئندہ کی کسی ضرورت کے لئے محفوظ رکھ لئے گئے ہیں، یہ ۶۰ ملین روپے ''جاری کردہ سرمایہ'' ہے، ۶۰ ملین روپے میں سے لوگوں نے ۵۰ ملین روپے کے لئے فارم جمع کرادیئے تو یہ ''اشتراک کردہ سرمایہ'' ہے۔

اگر درخواستیں زیادہ ہوں اور جاری کردہ سرمایہ کم ہو تو قرعہ اندازی کی جاتی ہے اور صرف انہی کی درخواستیں قبول کر کے انہیں حصہ دار بنایا جاتا ہے جن کا نام قرعہ اندازی میں نکل آئے۔ یہ اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ درخواستیں سرمائے سے کم وصول ہوں، جتنے شیئرز جاری کئے گئے تھے لوگوں نے اتنے شیئرز نہیں لئے تو اس سے نمٹنے کے لئے بینک یا دوسرے مالیاتی اداروں سے اس بات کی ضمانت لی جاتی ہے کہ جو حصے لوگوں نے نہ لئے وہ ہم لے لیں گے، اس ضمانت کو "ضمان الإکتتاب" (Under Writing) کہتے ہیں۔

بینک اس ضمانت پر کمپنی سے کمیشن کی شرح طے کرتا ہے، مثلاً اس ضمانت پر کل سرمائے کا ایک فیصد میں لوں گا، یہ کمیشن بینک بہرحال لیتا ہے چاہے اس کو کمپنی کے حصص (شیئرز) لینے پڑیں یا نہ لینے پڑیں، پھر اگر بینک کو حصے لینے پڑ جائیں تو حصے لے کر عموماً بینک اپنے پاس نہیں رکھتا، بلکہ بعد میں ان حصص کو فروخت کر دیتا ہے۔

یہ ضمانت ایک بینک سے بھی لی جاتی ہے اور تھوڑے تھوڑے سرمائے پر کئی بینکوں سے بھی لی جاسکتی ہے۔

کمپنی کے حصص (شیئرز)

جب لوگ کمپنی کے حصے لے کر سرمایہ دے دیتے ہیں، تو حصہ دار کو کمپنی ایک سرٹیفکیٹ جاری کرتی ہے جو اس بات کی سند ہوتی ہے کہ اس شخص کا کمپنی میں اتنا حصہ ہے، اس سرٹیفکیٹ کو اُردو میں "حصہ"، عربی میں "سھم" اور انگریزی میں "Share" کہتے ہیں۔

کاروبار جتنے سرمائے سے جاری کیا جاتا ہے اس سرمائے کو اکائیوں پر تقسیم کر کے ایک اکائی کو ایک حصے (Share) کی قیمت قرار دی جاتی ہے، مثلاً آج کل عموماً دس دس روپے کے شیئرز جاری کئے جاتے ہیں، یہ قیمت شیئر کے اُوپر لکھ دی جاتی ہے، یہ وہ رقم ہے جس کی ادائیگی پر یہ سرٹیفکیٹ جاری ہوا تھا، اس قیمت کو عربی میں "القیمة الإسمیة" اور انگریزی میں "Face Value" یا "Par Value" کہتے ہیں۔

شیئرز جاری کرنے کے دو طریقے ہیں، کبھی شیئر پر حصہ دار کا نام درج ہوتا ہے، اس کو "السهم المسجّل" (Registered Share) کہتے ہیں۔ کبھی شیئر اس طرح جاری ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کا نام درج نہیں ہوتا، جس کے ہاتھ میں ہوگا وہی اس کا مالک سمجھا جائے گا، اس کو "السهم لحامله" (Bearer Share) کہتے ہیں۔

ہمارے ہاں زیادہ تر کمپنیوں کے حصص رجسٹرڈ ہی ہوتے ہیں، کبھی بیئرر بھی ہوتے ہیں، جیسے این آئی ٹی میں دونوں صورتیں ہیں۔

حصص کی ایک تقسیم حصہ دار کے حقوق کے اعتبار سے ہوتی ہے، یعنی نفع وصول کرنے یا کمپنی کی پالیسی میں مداخلت کے اعتبار سے بھی حصص کی دو قسمیں ہیں:-

۱- السهم العادی (Ordinary Share)

۲- السهم الممتاز (Preference Share) جس کو "ترجیحی حصص" بھی کہتے ہیں ـــــ ان دو قسم کے حصص میں بنیادی فرق یہ ہے کہ "السهم الممتاز" کے حامل کو نفع تقسیم کرنے یا حقِ رائے دہی میں "السهم العادی" کے حامل سے مقدم رکھا جاتا ہے، "السهم الممتاز" کی ترجیح کی کئی صورتیں ہوتی ہیں:-

۱- "السهم الممتاز" کا نفع اس کے لگائے ہوئے سرمائے کی خاص شرح کے مطابق مقرر ہوتا ہے، (مثلاً اس کے لگائے ہوئے سرمائے کا دس فیصد (10%) پہلے "السهم الممتاز" کے حاملین میں نفع تقسیم کرکے ان کا معینہ نفع ان تک پہنچایا جاتا ہے، اس کے بعد اگر کچھ بچے تو "السهم العادی" کے حاملین کو ملتا ہے، ورنہ وہ نفع سے محروم رہیں گے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی سال کمپنی کو نفع نہیں ہوا تو ایسی صورت میں بھی "السهم الممتاز" کا نفع محفوظ رہتا ہے، آئندہ سال جب نفع ہوگا تو پہلے ان کو دیا جائے گا، اس کے بعد نفع بچا تو "السهم العادی" کو ملے گا۔

۲- بعض اوقات ترجیح کی صورت یہ ہوتی ہے کہ "السهم الممتاز" کے نفع کی شرح "السهم العادی" سے زیادہ رکھی جاتی ہے۔

۳- کبھی ترجیح اس طرح ہوتی ہے کہ کمپنی کے سالانہ اجلاس میں "السهم

الممتاز" والوں کو ووٹ کا حق ہوتا ہے، "السھم العادی" والے کو ووٹ کا حق نہیں ہوتا۔

۴۔ کبھی "السھم الممتاز" والے کو زیادہ ووٹ کا حق ہوتا ہے، اور "السھم العادی" کو کم ووٹ کا، مثلاً یہ کہ "السھم الممتاز" والے کو دو ووٹ کا، اور "السھم العادی" والے کو ایک ووٹ کا حق ہوگا۔

حاصل یہ کہ "السھم الممتاز" ترجیحی حصے کا نام ہے، پھر ترجیح کی شکلیں مختلف ہوسکتی ہیں، اس کی ضرورت عموماً اس وقت پیش آتی ہے جبکہ کسی خاص بڑی پارٹی (مثلاً انشورنس کمپنی وغیرہ) سے سرمایہ لینا ہو، اب وہ اس پر آمادہ نہیں کہ عام حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی حیثیت سے رقم لگائے، اس لئے کہ اس میں نفع طے شدہ نہیں، اور اس پر بھی آمادہ نہیں کہ محض قرض دہندہ (دائن) کی طرح سود پر قرض دے، اس لئے کہ محض قرض دہندہ کی حیثیت میں وہ کمپنی کی پالیسی پر اثرانداز نہیں ہوسکے گی، ایسی پارٹی سے سرمایہ لینے کے لئے اس کو ترجیحی حصص دیئے جاتے ہیں تاکہ اس کو مقررہ منافع بھی ملے اور کمپنی میں حصہ دار بھی ہو، چنانچہ یہ ایک اعتبار سے دائن اور ایک اعتبار سے حصہ دار ہوتی ہے۔

کمپنی کا اِنتظامی ڈھانچہ

کمپنی ایک قانونی شخص ہے جو وجود میں آنے کے بعد کاروبار کرے گا، مگر چونکہ یہ حقیقی شخص نہیں، لہٰذا اس قانونی شخص کی نمائندگی کے لئے حصہ داروں میں سے ہی چند افراد پر مشتمل ایک مجلس بنائی جاتی ہے جو کاروبار کرتی ہے، اس کو "مجلس الإدارة" (Board of Directors) کہتے ہیں۔

اس کا انتخاب تمام شیئر ہولڈرز کی ووٹنگ سے ہوتا ہے، پھر یہ بورڈ آف ڈائریکٹرز اپنے میں سے ایک کو سربراہِ ادارہ منتخب کرتا ہے، اس کو "العضو المنتدب" (Chief Executive) کہتے ہیں۔

یہ چیف ایگزیکٹو، بورڈ آف ڈائریکٹرز میں سے بھی ہوسکتا ہے اور باہر سے بھی کسی کو ملازم رکھا جاسکتا ہے، یہ بورڈ کی پالیسی کے ماتحت عملاً کام کرتا ہے۔

تمام شیئر ہولڈرز کا ایک سالانہ اجتماع ہوتا ہے جس کو "الجمعية العمومية السنوية" (Annual General Meeting) کہتے ہیں۔ اسی کا مخفف نام اے. جی. ایم (A.G.M) ہے۔ اس میں کاروبار کی پالیسی، اکاؤنٹس (حسابات) اور آڈٹ رپورٹ وغیرہ پیش کی جاتی ہیں۔ آئندہ کے لئے ڈائریکٹران کا انتخاب ہوتا ہے، ہر حصے کا ایک ووٹ ہوتا ہے، مثلاً کسی کے پاس دس شیئرز ہیں تو اس کے دس ووٹ ہوں گے، سالانہ اجتماع میں ووٹ دینے کے بعد شیئر ہولڈرز کا کمپنی کے کاروبار میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا ہے۔

کمپنی کے وجود میں آجانے کے بعد ختم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو اے. جی. ایم میں کمپنی کے تحلیل ہونے کا فیصلہ ہوجائے یا کمپنی دیوالیہ ہوجائے اور اس کے دیون اثاثوں سے بڑھ جائیں، ان دونوں صورتوں میں متعلقہ قانونی ادارے سے کمپنی ختم کرنے کی اجازت لینا ضروری ہے، قانونی اجازت لئے بغیر کمپنی کا وجود ختم نہیں کیا جاسکتا۔ اور عموماً ایسی صورت میں حکومت کی طرف سے کمپنی کے اثاثوں کو قرض خواہوں یا حصہ داروں میں تقسیم کرنے کے لئے ایک منتظم مقرر کیا جاتا ہے جسے "ریسیور" (Receiver) یا تحلیل کنندہ (Liquidator) کہتے ہیں۔

منافع کی تقسیم

کمپنی سال بھر کاروبار کرنے کے بعد سالانہ نفع کا حساب لگاتی ہے اور یہ طے کرتی ہے کہ کتنا نفع ہوا؟ اس کے بعد اس منافع کا کچھ حصہ بطور احتیاط کے محفوظ کر لیتی ہے، تاکہ آئندہ کمپنی کو کوئی نقصان ہو تو اس سے اس کا تدارک کیا جاسکے، اس کو عربی میں "احتیاطی" اور انگریزی میں "Reserve" کہتے ہیں۔ اس احتیاطی نفع کا تعین عموماً بورڈ آف ڈائریکٹرز کرتا ہے، اور قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے، اس لئے کہ احتیاطی نفع منہا کرکے باقی نفع پر ٹیکس لگتا ہے، خطرہ ہے کہ ٹیکس سے بچاؤ کے لئے کوئی کمپنی زیادہ نفع احتیاطی میں رکھ لے، اس لئے قانوناً بھی اس کی تحدید ہوتی ہے۔
احتیاطی نکالنے کے بعد بقیہ نفع شیئر ہولڈرز میں تقسیم ہوتا ہے، اب کمپنی کو جو

دراصل نفع ہوا ہے وہ "الربح"، نفع (Profit) ہے، اور جو بطورِ احتیاط رکھا گیا ہے وہ ''احتیاطی'' یا محفوظ فنڈ (Reserve) ہے، باقی نفع جو تقسیم ہوگا وہ "الربح الموزّع"، "Dividend" ہے۔ پرافٹ (Profit) اور ڈیویڈنڈ (Dividend) میں فرق یہ ہے کہ کل نفع پرافٹ ہے، اور اِحتیاطی نکالنے کے بعد جو تقسیم ہوگا وہ ڈیویڈنڈ ہے، پرافٹ شخصِ قانونی کمپنی کا نفع ہے، اور ڈیویڈنڈ شیئر ہولڈرز کا۔

(Dividend) کی تقسیم کے دو طریقے ہوتے ہیں، کبھی تو نقد نفع لوگوں کو فراہم کر دیا جاتا ہے، کبھی اس نفع کے دوبارہ حصص (شیئرز) جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ اس قسم کے حصے کو ''بونس شیئر'' (Bonus Share) کہتے ہیں۔ بونس شیئر جاری کرنے سے کمپنی کا سرمایہ بڑھ جاتا ہے، ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جبکہ کمپنی کی کیش پوزیشن کمزور ہو، یعنی اس کے پاس نقد رقم کم ہو تو بجائے نقد نفع دینے کے مزید حصص جاری کر دیئے جاتے ہیں۔ کسی حصہ دار کو مثلاً دس روپے دینے کے بجائے دس روپے کا حصہ دے دیا جاتا ہے، لیکن اس کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ ''منظور شدہ سرمایہ'' میں اس کی گنجائش ہو، مثلاً ۸۰ ملین کی اجازت ملی تھی، ان میں سے ابھی تک ۶۰ ملین جاری کئے تھے، ۲۰ ملین کی گنجائش ہے، اگر منظور شدہ سرمائے میں مزید گنجائش نہیں ہے تو دوبارہ درخواست دے کر اجازت لی جائے گی ــــــ بونس شیئرز جاری کرنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کمپنی کے شیئرز کی بازاری قیمت (Market Value) قیمة اسمية (Face Value) سے کم نہ ہو، اگر بازار میں قیمت گر گئی ہے تو اب بونس شیئرز جاری کرنے میں حصہ داران (شیئر ہولڈرز) کا نقصان ہے، مثلاً دس روپے کے شیئر کی قیمت بازار میں ۹ روپے ہے تو حصہ دار کو دس روپے کے بجائے ۹ روپے کا شیئر ملے گا تو اس کو ایک روپیہ کا نقصان ہوا۔

''لمیٹڈ'' کمپنی کا تصوّر

لمیٹڈ کمپنی کو "الشركة المحدودة" کہتے ہیں، اس سے مراد 'مسئولیة' (Liability) یعنی ذمہ داری کا محدود ہونا ہے۔ لمیٹڈ کمپنی کے حاملانِ حصص کی ذمہ

داری ان کے لگائے ہوئے سرمائے کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہوگیا تو حاملانِ حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا، اسی طرح کمپنی کی ذمہ داری بھی اس کے اثاثوں کی حد تک محدود ہوگی، قرضے ادا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کمپنی کے اثاثے قرقی کرائے جاسکتے ہیں، اثاثوں سے زیادہ مطالبہ نہیں ہوگا، اسی لئے لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ ''لمیٹڈ'' لکھنا ضروری ہے، تاکہ قرض دینے والا اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرض دے کہ اس مدیون کی ذمہ داری محدود ہوگی۔

عام طور پر تو کمپنیاں ہی لمیٹڈ ہوتی ہیں، لیکن کبھی شرکت (Partner Ship) بھی لمیٹڈ ہوتی ہے۔

پرائیویٹ کمپنی

کمپنی کی دو قسمیں ہیں: ۱- پبلک کمپنی (شركة عامّة)، ۲- پرائیویٹ کمپنی (شركة خاصّة)، اب تک جو تفصیلات ذکر کی گئی ہیں، وہ ''پبلک کمپنی'' کی ہیں۔ پرائیویٹ کمپنی بھی ایک شخصِ قانونی ہوتا ہے، مگر اس کے شرکاء کی تعداد محدود ہوتی ہے، (مثلاً ہمارے یہاں کم از کم ۲، اور زیادہ سے زیادہ ۵۰ شرکاء ہوسکتے ہیں)۔ یہاں سرمائے کے حصص جاری نہیں کئے جاتے ہیں، پراسپکٹس نہیں شائع کیا جاتا ہے، اس کے شیئرز بازارِ حصص (اسٹاک ایکسچینج) میں فروخت نہیں ہوتے ہیں ــــــ قانونی تقاضا ہے کہ پرائیویٹ کمپنی کے ساتھ ''پرائیویٹ'' لکھنا ضروری ہوتا ہے۔

شرکت اور کمپنی میں فرق

شرکت (Partner Ship) کو عربی "الشِرْكة" (بكسر الشين وسكون الراء) یا "شركة الأشخاص" کہتے ہیں۔ اور کمپنی کو "شَرِكة المساهمة" (بفتح الشين وكسر الراء) کہتے ہیں۔ شرکت اور کمپنی میں کئی امتیازی فرق ہیں:-

۱- شرکت میں ہر شخص کاروبار کے تمام اثاثوں کا مشاع طور پر مالک ہوتا

ہے، ہر شریک دُوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے، ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے، مثلاً کوئی دَین واجب ہوا تو تمام شرکاء سے برابر درجے میں مسئولیت ہوگی۔ مگر کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا، کمپنی ایک "شخصِ قانونی" ہے، اس کا الگ وجود ہے، اور حصہ داران کا الگ وجود ہے، حاملینِ حصص اس حد تک تو کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہیں کہ اگر کمپنی تحلیل ہو اور اس کے اثاثے تقسیم ہوں تو ان کو متناسب حصے ملیں گے، لیکن کمپنی کی تحلیل سے پہلے قانون حاملِ حصص کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمپنی کے اثاثوں میں تصرف کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حاملِ حصص مدیون ہو اور اس کے اثاثے قرق کئے جائیں تو جو شیئرز اس کے ہاتھ میں ہیں وہ تو قرق ہوں گے، مگر اس کے شیئر کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں سے اس کا جو حصہ بنتا ہے وہ قرق نہیں ہوگا، اس لئے کہ قانوناً کمپنی کے اثاثوں پر اس کو تصرف کا حق نہیں ہے۔

۲- شرکت میں کاروبار کی طرف سے کسی پر دعویٰ ہو یا کسی کی طرف سے کاروبار پر دعویٰ ہو تو تمام شرکاء مدعی یا مدعا علیہ ہوں گے، مگر کمپنی خود ایک شخصِ قانونی ہے، لہٰذا کمپنی خود ہی مدعی یا مدعا علیہ ہوگی، حاملینِ حصص (شیئر ہولڈرز) نہیں ہوں گے، اس شخصِ قانونی کی نمائندگی عدالت میں اِنتظامیہ کا کوئی فرد کرے گا۔

۳- شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، کمپنی کا الگ سے قانونی وجود ہوتا ہے، جس کو "شخصِ قانونی" کہتے ہیں۔

۴- شرکت میں کوئی شریک شرکت فسخ کر کے اپنا سرمایہ نکالنا چاہے تو نکال سکتا ہے، مگر کمپنی میں سے اپنا سرمایہ نہیں نکالا جاسکتا، البتہ شیئر فروخت کئے جاسکتے ہیں۔

۵- شرکت میں عموماً ذمہ داری کاروبار کے اثاثوں تک محدود نہیں ہوتی، کمپنی میں ذمہ داری محدود ہوتی ہے۔

کمپنی کے لئے فنڈز کی فراہمی

کمپنی میں ابتداءً کچھ سرمایہ "Sponsors" یعنی کمپنی بنانے والوں کی طرف سے ہوتا ہے، سرمائے کا بہت سا حصہ اِجرائے حصص کے ذریعے عوام سے حاصل کیا

جاتا ہے، مگر عموماً یہ سرمایہ کمپنی کے لئے کافی نہیں ہوتا، وقتاً فوقتاً مزید سرمایہ حاصل کرنے کی ضرورت بھی پیش آتی رہتی ہے، اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے جاتے ہیں:-

۱- کبھی مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے کمپنی مزید حصص جاری کرتی ہے، جبکہ منظور شدہ (Autorised) سرمائے میں اس کی گنجائش ہو یا دوبارہ اجازت لی جائے۔ یہ حصص جو اَب جاری کئے گئے ہیں، ان میں قدیم حصہ داران (شیئر ہولڈرز) کا ترجیحی حق ہوتا ہے کہ اگر وہ نئے حصص لینا چاہیں تو لے لیں، جن نئے حصص میں پرانے حصہ داروں کو ترجیحی حق ہوتا ہے ان کو "سهـام الأولـوية" (Right Shares) کہتے ہیں۔

یہ حق شفعہ سے ملتا جلتا ہے، اس کے قدیم حصہ داران کو دو فائدے ہوتے ہیں، (الف) عموماً کمپنی کا کاروبار شروع ہونے کے بعد شیئر کی بازاری قیمت (Market Value) لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ ہوتی ہے، اس لئے ان کے خریدنے میں نفع ہوتا ہے، اس نفع کے لینے کا حق پہلے قدیم حصہ داران کو دیا جاتا ہے، مثلاً لکھی ہوئی قیمت ۱۰ روپے اور بازاری قیمت ۲۰ روپے ہے، تو شیئر ۱۰ روپے میں ملے گا مگر فروخت ہوگا ۲۰ روپے میں، لہٰذا شیئر لینے والے کو دس روپے کا نفع ہوگا۔ (ب) دُوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مزید سرمائے کے حصص جاری کرنے سے حصہ داران کی شرکت کی نسبت میں کمی آجاتی ہے، ان کو اپنی نسبت بحال کرنے کے لئے نئے شیئرز خریدنے کا ترجیحی حق دیا جاتا ہے، مثلاً پہلے کمپنی میں ایک لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا، جس میں سے کسی نے دو ہزار روپے کے شیئرز لئے تھے، تو اس کی شرکت کی نسبت دو فیصد ہے، اب جب کمپنی ایک لاکھ کے مزید حصص جاری کرے گی تو اَب کمپنی کا سرمایہ دو لاکھ ہوگیا، ۲ ہزار کی نسبت ۲ لاکھ سے ایک فیصد رہ جائے گی، اس لئے اس کو حق دیا گیا ہے کہ مزید دو ہزار کے شیئرز لے کر دوبارہ نسبت دو فیصد کرلے۔

۲- مزید حصص جاری کرنے میں کچھ مشکلات بھی ہوتی ہیں، مثلاً سرمائے کی منظوری کی حدود و قیود ہوتی ہیں، حصہ داران میں اضافہ ہوجاتا ہے اور ان کا کمپنی پر

کنٹرول ہوتا ہے۔ اس جیسی مشکلات کی وجہ سے بہت سی کمپنیاں مزید حصص جاری کرنے کا طریقہ پسند نہیں کرتیں، بلکہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے قرض لیتی ہیں، قرض لینے کی دو صورتیں ہیں:۔

الف:...... بینک یا کسی مالیاتی ادارے سے قرض لیا جاتا ہے، جو عموماً سود پر لیا جاتا ہے۔

ب:...... عوام کو شیئرز لینے کی نہیں، بلکہ قرض دینے کی دعوت دی جاتی ہے، اس کے لئے دو طرح کی دستاویزات کمپنی جاری کرتی ہے، جس کو لے کر لوگ قرض دیتے ہیں:۔

ا:...... "سند" (Bond) (بانڈ)

بانڈ معینہ مدّت کے لئے جاری ہوتا ہے، اس وقت تک اس پر سالانہ سود ملتا رہتا ہے۔ مدّت کبھی زیادہ ہوتی ہے، کبھی کم، ایسا بھی ہوا ہے کہ بانڈ ننانوے سال کے لئے جاری ہوئے۔ بانڈز کا حامل مدّت پوری ہونے سے پہلے اس کو فروخت بھی کرسکتا ہے۔

۲:...... "شهادة الإستثمار" (Debenture) (ڈبینچر)

بانڈ اور ڈبینچر میں اتنی بات قدرِ مشترک ہے کہ ان دونوں کا حامل کمپنی میں حصہ دار نہیں ہوتا، محض دائن ہوتا ہے، جس کو کمپنی کی طرف سے سالانہ سود دیا جاتا ہے اور وقتِ مقرّر پر رقم واپس کردی جاتی ہے۔ اور ان دونوں میں فرق دو طرح سے ہے، ایک تو یہ کہ بانڈ صرف قرضے کی دستاویز ہے، اب بعض اوقات قرضوں کے بانڈز کو تحفظ دینے کے لئے ایک دستاویز جاری کی جاتی ہے، جس میں ان بانڈز کو کمپنی کی کسی ایک جائیداد یا بہت سی جائیدادوں کے ساتھ متعلق کردیا جاتا ہے کہ اگر یہ قرضے ادا نہ ہوئے تو ان جائیدادوں سے ادا کردیئے جائیں گے، اس کو (Debenture) کہتے ہیں۔ گویا بانڈ قرضے کی دستاویز ہے اور ڈبینچر اس کے رہن کا وثیقہ ہے۔

دُوسرا فرق یہ ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ ہوجائے تو اثاثوں سے جن لوگوں کا حق متعلق ہوتا ہے، ان کے حقوق کی ادائیگی کی قانوناً ترتیب ہوتی ہے، اس ترتیب میں ڈبینچر اس

جائیداد کی حد تک مقدّم ہوتا ہے جس کو رہن بنایا گیا تھا، بانڈز کی ادائیگی اس کے بعد ہوتی ہے۔

بانڈ کی ایک قسم ایسی ہے جس میں حامل کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ بانڈ کو شیئر میں تبدیل کرلے، پہلے وہ دائن تھا، اب وہ کمپنی میں حصہ دار ہوگا، اس کے لئے کبھی مدّت مقرّر ہوتی ہے کہ اتنی مدّت کے بعد شیئر میں بدل سکتے ہیں، اور کبھی مدّت مقرّر نہیں ہوتی، کبھی مخصوص شرائط ہوتی ہیں، کبھی نہیں۔ ایسے بانڈز کو "سندات قابلة للتحویل" (Convertible Bonds) کہتے ہیں۔

۳:..... "اِجارۃ" سرمایہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور رائج ہوا ہے جس کو "اِجارہ" (Leasing) کہتے ہیں۔ اِجارہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک "آپریٹنگ لیز" (Operating Lease)، یہ وہ اِجارہ ہے جو عام طور پر معروف ہے، اس میں واقعتاً فریقین میں مؤجر و مستأجر کا رشتہ ہوتا ہے، یہ اِجارہ سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں ہوتا، سرمایہ حاصل کرنے کا ذریعہ دُوسری قسم کا اِجارہ ہے، جس کو "فائنشل لیز" (Financial Lease) کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ یہاں اصل مقصود اِجارے کا رشتہ قائم کرنا نہیں ہوتا، بلکہ کمپنی کو جامد اَثاثوں کی (مثلاً مشینری کی) ضرورت ہے تو کمپنی بینک سے قرض لے کر خود مشینری خریدنے کے بجائے کسی بینک یا مالیاتی ادارے کو یہ کہتی ہے کہ یہ مشینری خرید کر ہمیں کرایہ پر دے دو۔ اس دوران مشینری کا مالک بینک یا مالیاتی اِدارہ ہوگا اور کمپنی کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے اسے استعمال کرتی ہے، ایک مخصوص مدّت کے لئے کرایہ اس تناسب سے طے کیا جاتا ہے کہ اس سے مشینری کی قیمت بھی وصول ہوجائے، اور اتنی مدّت کے لئے اگر یہ رقم قرض دی جاتی تو اس پر جتنا سود ملنا تھا وہ بھی وصول ہوجائے۔ جب یہ مدّت گزر جاتی ہے اور کرایہ کی شکل میں مشینری کی قیمت بمعہ معینہ شرحِ سود ادا ہوجاتی ہے تو اَب یہ مشینری خودبخود کمپنی کی مملوک بن جاتی ہے، یہ بات کبھی معاہدے میں لکھی ہوتی ہے اور کبھی لکھی تو نہیں جاتی، مگر معروف اسی طرح ہے۔

قرض کی بجائے اِجارے کا یہ طریقہ اختیار کرنے کے دو مقصد ہوتے ہیں:-

۱) اس کی وجہ سے بعض صورتوں میں ٹیکس سے بچت ہوجاتی ہے یا ٹیکس میں کمی ہوجاتی ہے۔

۲) قرض کی وصولیابی کے لئے اجارے کا طریقہ بہ نسبت اِقراض کے زیادہ باعثِ اعتماد ہے، اس لئے کہ اجارے میں مشینری مؤجر کی ملکیت میں ہوتی ہے، اس پر اسی کا لیبل لگا رہتا ہے، اگر بالفرض رقم نہ ملی تو مؤجر کو کوئی خطرہ نہیں، اس لئے کہ مشینری اسی کی ملکیت میں ہے۔

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ فنانشل لیزنگ سے چونکہ ایک درجے میں سرمایہ حاصل کرنے میں مدد لینا ہی مقصود ہوتا ہے، اس لئے اس کو فنڈز کی فراہمی کا ایک طریقہ شمار کرکے اس کو ''تمویل'' (Financing) کے ذیل میں لایا گیا ہے، ورنہ حقیقت میں یہ ''تمویل'' (Financing) نہیں ہے، اس لئے کہ تمویل وہ ہوتی ہے جس میں کوئی چیز کمپنی کی ملک میں آجائے، اور یہاں وہ مشینری ابھی کمپنی کی ملکیت میں نہیں آئی۔

کمپنی کے حسابات

ہر کمپنی اپنے حسابات باقاعدہ رکھنے کا اہتمام بھی کرتی ہے، حسابات رکھنے کے اُصول بھی ہوتے ہیں، حسابات رکھنا ایک باقاعدہ فن ہے، اس کا اجمالی تعارف بھی ضروری ہے، اس لئے کہ معاملات کو سمجھنے کے لئے اس کی بھی کافی ضرورت پڑتی ہے۔

تختۂ توازن (Balance Sheet)

کمپنی کی املاک کو اُردو میں ''اثاثے''، عربی میں ''موجودات'' یا ''اصول'' اور انگریزی میں "Assets" کہتے ہیں۔ اور دُوسروں کے جو حقوق کمپنی کے ذمے واجب ہوتے ہیں ان کو ''ذمہ داریاں''، اور عربی میں ''دیـــون'' یا ''حـــقـــوق'' یا ''مطلوبات'' اور انگریزی میں "Liabilities" کہتے ہیں۔

کمپنی سال میں ایک بار یا کسی معینہ تجارتی دورانیہ میں اپنی ذمہ داریوں اور اثاثوں کی تفصیل تیار کرتی ہے، اس کو ''تختۂ توازن''، ''لائحۃ الرصید''، "Balance

"Sheet" کہتے ہیں۔ بیلنس شیٹ کا اِجمالی تعارف یہ ہے کہ ایک طرف کمپنی کے اثاثے اور دُوسری طرف ذمہ داریاں لکھ لی جاتی ہیں۔ ''اثاثوں'' سے مراد کمپنی کی املاک اور واجب الوصول (Receivable) اموال ہیں، اور ذمہ داریوں سے مراد وہ مالی واجبات ہیں جو کمپنی کے ذمے دُوسروں کے لئے واجب الادا ہیں، پھر ان دونوں میں تناسب دیکھا جاتا ہے، اور اس تناسب کی بنیاد پر کمپنی کا اِستحکام معلوم کیا جاتا ہے۔

ذمہ داریوں اور اَثاثوں میں کیا تناسب ہونا چاہئے؟ اس کے بارے میں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر ایک اور دو کی نسبت ہو، یعنی اثاثے ذمہ داریوں کے مقابلے میں دوگنے ہوں تو کمپنی خوب مستحکم سمجھی جاتی ہے، چنانچہ ایسی کمپنی کو بینک وغیرہ قرض دینے کے لئے زیادہ آمادہ ہوتے ہیں۔

بیلنس شیٹ تیار کرنے کے طریقے کی کچھ وضاحت یہ ہے کہ ایک طرف درج ذیل طریقے سے کمپنی کے اثاثے لکھے جاتے ہیں:-

اثاثے

اس کو عربی میں ''موجودات'' اور انگریزی میں "Assets" کہتے ہیں۔

اثاثے تین قسم کے لکھے جاتے ہیں:-

۱- رواں اثاثے (Current Assets) ان کو عربی میں **"موجودات متداولة"** کہتے ہیں، جو نقد ہوں یا بہ سہولت نقد پذیر ہوں۔ اس میں یہ چار مدات شامل ہوتی ہیں: (الف) نقد (Cash)۔ (ب) کمپنی نے جو رقم کسی سے وصول کرنی ہے (Accounts Receivable)، مثلاً کوئی چیز فروخت کی ہے، اس کی قیمت ابھی قابلِ وصول ہے۔ (ج) اگر کمپنی نے دُوسرے اِداروں کو قرض دے کر اس کی دستاویزات اور رسیدیں اپنے پاس رکھی ہوئی ہیں تو وہ بھی اس کے اثاثوں میں شمار ہیں، مثلاً بانڈز وغیرہ، اس کو "Notes Receivable" کہتے ہیں۔ (د) کسی اور کمپنی یا اِدارے میں سرمایہ کاری کی گئی ہے اور وہاں سے رُقوم کی وصولی متوقع ہے (Investment)۔

۲- جامد اثاثے (Fixed Assets) ان کو عربی میں "موجودات ثابتة"

کہتے ہیں، ان سے مراد غیر نقد اثاثے ہیں جو جلدی نقد پذیر نہیں، جیسے مشینری، بلڈنگ وغیرہ۔

۳- غیر مادّی اثاثے (Intangible Assets) ان کو عربی میں "موجودات غیر مادیۃ" کہتے ہیں، ایسے اثاثے جن کو مادّی طور پر محسوس نہیں کیا جاسکتا، جیسے گڈوِل، اس کی قیمت بھی لگتی ہے، بیع وشراء بھی ہوتی ہے مگر یہ کوئی محسوس مادّی چیز نہیں، یا کسی تجارت کی ایڈورٹائزنگ (تشہیر) پر رقم خرچ ہوئی، اس تشہیر کا کئی سال تک فائدہ ہوگا، یہ بھی غیر مادّی اثاثوں میں شامل ہوگی۔

اثاثے لکھنے کے بعد یہ بھی لکھا جاتا ہے کہ یہ اثاثے کن ذرائع سے حاصل ہوئے، ان کے لئے سرمائے کا حصول (Financing) کہاں سے ہوئی۔

اثاثوں کی قیمتیں مختلف ہوتی ہیں، ایک وہ قیمت جو بوقتِ خرید تھی، پھر اِستعمال کے بعد فرسودگی کی وجہ سے اس کی قیمت کم ہوجاتی ہے، زمانہ گزرنے سے قیمت میں اضافہ بھی ہوتا ہے، لیکن چونکہ قیمت کے اس تغیر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ مشکل ہوتا ہے اس لئے بیلنس شیٹ میں اثاثوں کی وہ قیمت لگائی جاتی ہے جس پر وہ اصلاً خریدے گئے تھے، اس کو "کتابی قیمت" یا "Book Value" کہا جاتا ہے، چونکہ ان اثاثوں کی موجودہ بازاری قیمت عموماً مختلف ہوتی ہے اس لئے عموماً بیلنس شیٹ سے کمپنی کی صورتِ حال کی حقیقی نمائندگی نہیں ہوتی، بلکہ ظنی اور تقریبی ہوتی ہے، اس میں دھوکا بھی چلتا ہے۔

ذمہ داریاں

بیلنس شیٹ کے دُوسرے حصے میں "ذمہ داریاں" لکھی جاتی ہیں، یعنی وہ یہ رُقوم ہیں جو کمپنی پر واجب الادا ہیں، اور کمپنی کو اَدا کرنی ہیں۔ ذمہ داریوں میں ملازمین کی تنخواہیں جو دینی ہیں، کوئی چیز خریدی ہے اس کی قیمت واجب الادا ہے، سرمایہ لیا ہے وہ واجب الادا ہے، اس جیسی چیزیں داخل ہیں۔ ذمہ داریاں لکھنے کی ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے طویل المیعاد ذمہ داریاں لکھی جاتی ہیں، مثلاً قرض لیا ہے جو پانچ سال کے بعد اَدا کرنا ہے، ایسی ذمہ داریوں کو "Long Time Liabilities"

کہتے ہیں۔ اس کے بعد ''رواں ذمہ داریاں'' لکھی جاتی ہیں، جو تھوڑی مدّت میں ادا کرنی ہیں، مثلاً ملازمین کی تنخواہ، ٹیکس، کوئی چیز خریدی ہے اس کا بل ادا کرنا ہے، طویل المیعاد قرضوں کا وہ حصہ جو ایک سال کے اندر اُدا کرنا ہے، ایسی ذمہ داریوں کو "Current Liabilities" کہتے ہیں۔

صافی مالیت

اثاثوں میں سے ذمہ داریاں منہا کرکے جو باقی بچے اس کو ''صافی مالیت''، ''المالية الصافية''، "Net Worth" کہتے ہیں۔ یہی مالیت دراصل حصہ داروں کی ملکیت ہوتی ہے۔

نفع، نقصان کا میزانیہ

تختۂ توازن (بیلنس شیٹ) تو کمپنی کا مالی استحکام معلوم کرنے کے لئے ہوتی ہے، اس کا اس بات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا کہ کمپنی کو کتنا نفع یا کتنا نقصان ہوا؟ نفع، نقصان کو بیان کرنے کے لئے جو رپورٹ تیار کی جاتی ہے اس کو عربی میں ''اللائحة المالية'' یا ''البيان المالي'' اور انگریزی میں "Income Statement" کہتے ہیں۔ اس کی ترتیب یہ ہوتی ہے:-

مجموعی فروختگی (Gross Sales)

واپسی (Returns)

صافی فروختگی (Net Sales)

براہِ راست اخراجات (Direct Expenses)

اجمالی منافع (Gross Profit)

بالواسطہ اخراجات (Indirect Expenses)

صافی منافع (قبل ٹیکس) (Net Profit) (Pre Tax)

ٹیکس (Tax)

صافی منافع (بعد ٹیکس) (Net Profit) (After Tax)

محفوظ فنڈ (Reserve)

منافع قابلِ تقسیم (Dividend)

''واپسی'' سے مراد وہ اشیاء ہیں جو بیچنے کے بعد واپس لینی پڑتی ہیں، وہ چونکہ فروختگی میں شامل ہوچکی ہیں اس لئے ان کو منہا کرکے جو فروختگی بچے گی وہ ''صافی فروختگی'' ہے۔ ''براہِ راست اِخراجات'' سے مراد وہ اِخراجات ہیں جو اس چیز کی تیاری پر ہوتے ہیں جو کمپنی کا اصل سامانِ تجارت ہے، مثلاً اگر کوئی مل ہے تو اس کے خام مال کی خریداری پر جو اِخراجات ہوں گے وہ براہِ راست اِخراجات میں داخل ہوں گے، یا کوئی اخبار نکلتا ہے تو اس کی طباعت اور اس کے کاغذ کے اِخراجات اسی مد میں آئیں گے۔ ''صافی فروختگی'' سے یہ اِخراجات منہا کرکے جو رقم بچے وہ کمپنی کا ''اِجمالی نفع'' ہے، ''بالواسطہ اِخراجات'' سے مراد وہ اخراجات ہیں جن کا تعلق براہِ راست اشیائے فروخت کی تیاری سے نہیں ہے، مثلاً دفتر کی عمارت کا کرایہ، ایڈیٹر کی تنخواہ وغیرہ۔ ''براہِ راست اِخراجات'' اور ''بالواسطہ اخراجات'' میں عملی فرق یہ ہے کہ براہِ راست اِخراجات اس وقت ہوں گے جبکہ اشیاء تیار ہوں، اگر اشیاء تیار نہ ہوں تو یہ اِخراجات نہیں ہوں گے، پھر اشیاء زیادہ تیار ہوں تو خرچہ بھی زیادہ ہوگا، کم تیار ہوں تو اِخراجات بھی کم ہوں گے۔ اور بالواسطہ اِخراجات بہرحال بدستور جاری رہیں گے، چاہے پروڈکشن ہو یا نہ ہو، کم ہو یا زیادہ۔ ''اِجمالی نفع'' سے اس قسم کے اِخراجات منہا ہوں تو بقیہ ''صافی نفع'' (قبل از ٹیکس) ہے، پھر اس میں سے حکومت کو ادا کیا جانے والا ٹیکس منہا ہوکر بقیہ ''صافی نفع'' (بعد ٹیکس) ہے، اس ''صافی نفع'' کا کچھ حصہ محفوظ فنڈ یا ریزرو میں منتقل کرنے کے بعد جو منافع بچتا ہے وہ ''قابلِ تقسیم منافع'' یا "Distributable Profit" کہلاتا ہے۔

انکم اسٹیٹمنٹ میں جو صافی نفع دِکھایا جاتا ہے اس کا کیش کی شکل میں ہونا ضروری نہیں، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کمپنی نفع بہت دِکھاتی ہے، مگر اس کے پاس نقد اتنا نہیں ہوتا بلکہ وہ پروڈکشن میں لگا ہوا ہوتا ہے، ایسی صورتوں میں ہی ''بونس شیئر'' جاری کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

بازارِ حصص

(Stock Exchange)

کمپنی کے اَحکام پر غور کرنے کے لئے "بازارِ حصص" کی بنیادی تفصیلات کا معلوم ہونا بھی بہت اہم اور ضروری ہے۔

تعارف وضرورت

جب کوئی شخص کمپنی کے شیئرز لے کر اس کا حصہ دار بن جائے تو اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی وقت وہ اپنی رقم واپس لے کر شرکت ختم کرسکے، بلکہ جب تک کمپنی وجود میں ہے، اس سے حصے کی رقم واپس نہیں لی جاسکتی لیکن چونکہ بہت سے شرکاء یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی شرکت ختم کر کے اپنے حصے کو نقد میں تبدیل کرلیں، اس لئے یہ ضمانت فراہم کرنا ضروری تھا کہ رقم لگانے کے بعد بوقتِ ضرورت اپنے شیئرز کو نقد میں تبدیل کرنا ممکن ہوگا، اس کے لئے "بازارِ حصص" قائم کیا گیا، جس میں شیئرز بیچے جاسکتے ہیں، یعنی کمپنی کے حصہ دار اپنی شرکت ختم کر کے کمپنی سے تو اپنا سرمایہ واپس نہیں لے سکتے لیکن بازارِ حصص میں وہ اپنا حصہ کسی اور کو بیچ سکتے ہیں، جس کے نتیجے میں خریدار ان کی جگہ کمپنی کا حصہ دار بن جاتا ہے، جس جگہ شیئرز کی خرید وفروخت ہوتی ہے اس کو "بازارِ حصص" (Stock Market) کہتے ہیں۔

شیئرز کی خرید وفروخت کے دو طریقے ہیں: ایک یہ کہ دو شخص کسی اِدارے کے توسط کے بغیر شیئرز کی خرید وفروخت کریں۔ دُوسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی اِدارے کے توسط سے شیئرز کی خرید وفروخت کریں۔ وہ اِدارہ "اسٹاک ایکسچینج" ہے جو شیئرز کی خرید وفروخت کی نگرانی بھی کرتا ہے اور واسطہ بھی بنتا ہے، اس کو عربی میں

"بورصہ" کہتے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کے توسط کے بغیر جو شیئرز کا کاروبار ہوتا ہے اس کو "عملیات من وراء المنصة" (Over The Counter Transactions) کہتے ہیں۔ اس انداز کی خرید وفروخت کا کوئی خاص نظم نہیں، اس کی تفصیلات جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ جو خرید و فروخت اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے ہوتی ہے اس کی چند تفصیلات سمجھنا ضروری ہے۔

اسٹاک ایکسچینج ایک پرائیویٹ ادارہ ہوتا ہے، جو حکومت کی اجازت و سرپرستی کے ساتھ کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے، لیکن اسٹاک ایکسچینج انہی کمپنیوں کے شیئرز کا کاروبار کرتا ہے جو قابلِ اعتماد ہوں اور کچھ نہ کچھ ساکھ رکھتی ہوں۔ جن کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے ان کو "Listed Companies" کہتے ہیں۔ ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید وفروخت اسٹاک ایکسچینج میں بھی ہوسکتی ہے اور "اوور دی کاؤنٹر" بھی ہوسکتی ہے۔ کسی کمپنی کی لسٹنگ کبھی اس کے وجود میں آجانے کے بعد ہوتی ہے، کبھی کمپنی منظور ہونے کے بعد اس کے کاروبار شروع ہونے سے پہلے، بلکہ کبھی شیئرز فلوٹ ہونے سے بھی پہلے کمپنی کی لسٹنگ ہوجاتی ہے، اس کو عبوری (Provisional) لسٹنگ کہتے ہیں، اس کا کاؤنٹر بھی الگ ہوتا ہے۔ جن کمپنیوں کے شیئرز اسٹاک ایکسچینج نہیں لیتا ان کو "Unlisted Companies" کہتے ہیں۔ ان کے شیئرز کی خرید و فروخت "اوور دی کاؤنٹر" ہی ہوسکتی ہے، اسٹاک ایکسچینج میں نہیں ہوسکتی۔

ممبر شپ

اسٹاک ایکسچینج میں ہر شخص شیئرز کی خرید وفروخت کا کام نہیں کرسکتا، اس کے لئے ممبر ہونا ضروری ہے، ممبر شپ کی فیس بھی ہوتی ہے، ممبر ہونا اس لئے ضروری ہے کہ اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کا کاروبار بہت وسیع، نازک اور فنی نوعیت کا ہوتا ہے، وہاں کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں، ایک نیا ناتجربہ کار شخص کاروبار میں غلطی بھی کرسکتا ہے، اور ادارہ وہاں ہونے والے تمام معاملات میں ادائیگیوں کا ذمہ دار ہوتا ہے، لہٰذا

ادارہ ہر شخص کو خرید و فروخت کی اجازت دے کر اس کے معاملات کا ذمہ دار نہیں بننا چاہتا، اس لئے ممبر ہونا ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔

اسٹاک ایکسچینج میں دلّالی

اسٹاک ایکسچینج کے ممبر اپنے لئے بھی شیئرز خریدتے ہیں اور بحیثیت دلّال کمیشن لے کر دُوسروں کے لئے بھی خریدتے ہیں، غیرممبر کو شیئرز خریدنے ہوں تو وہ کسی دلّال کے واسطے سے خریدتا ہے، شیئرز خریدنے کے لئے دلّال کو آرڈر دینے کی تین صورتیں ہیں:-

۱- مارکیٹ آرڈر (Market Order)

یعنی ایسا آرڈر جس میں دلال سے یہ کہہ دیا گیا ہو کہ مارکیٹ میں جو بھی ریٹ ہو، اس پر فلاں کمپنی کے شیئرز خرید لئے جائیں۔

۲- لمیٹڈ آرڈر (Limited Order)

یعنی ایک قیمت مقرّر کرکے آرڈر دیا جائے کہ اگر اس قیمت پر شیئرز مل جائیں تو لے لئے جائیں، اس سے زیادہ قیمت پر نہ خریدے جائیں۔

۳- اسٹاپ آرڈر (Stop Order)

یعنی شیئرز کا مالک اپنے شیئرز کی بیع کا مشروط آرڈر دیتا ہے کہ اگر اس کی قیمت بحال رہے یا بڑھتی رہے تو شیئرز نہ بیچنا، اور اگر قیمت گرنے لگے تو بیچ دینا۔

شیئرز کی قیمتوں کا تعین

کمپنیوں کے شیئرز کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اس میں کمپنی کے اثاثوں کو بھی دخل ہوتا ہے، اثاثے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے، لیکن اثاثوں کے علاوہ اور کئی خارجی عوامل سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں، مثلاً منافع کے اِمکانات، طلب و رسد کا رُجحان، سیاسی حالات، موسمی حالات، غیرمادّی عوامل جیسے بعض افواہوں اور تخمینوں سے بھی قیمتیں اثر پذیر ہوتی ہیں۔ چونکہ قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ

میں خارجی عوامل بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اس لئے شیئرز کی قیمتوں سے کمپنی کے اثاثوں کی حقیقی نمائندگی نہیں ہوتی ـــــــ کسی کمپنی کے شیئرز کی قیمت بڑھ جائے تو اس شیئر کی مارکیٹ کو اسٹاک ایکسچینج کی اِصطلاح میں "Bull Market" کہتے ہیں، اور قیمت کم ہوجائے تو اسے "Bear Market" کہتے ہیں۔

خریدارِ حصص کی قسمیں

شیئرز خریدنے والے دوطرح کے ہوتے ہیں:-

۱- بعض لوگ کمپنی میں حصہ دار بننے کے لئے شیئرز خریدتے ہیں، اور شیئرز اپنے پاس رکھ کر سالانہ نفع حاصل کرتے ہیں، مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔

۲- اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شیئرز کو بذاتِ خود مالِ تجارت سمجھ کر اس کی خرید و فروخت کرتے ہیں، جب شیئرز کی قیمت کم ہو اس وقت خریدتے ہیں، اور جب قیمت بڑھ جائے تو بیچ دیتے ہیں۔ دونوں قیمتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ ان کا نفع ہوتا ہے۔ قیمتوں کے بڑھنے کی وجہ سے جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کو "Capital Gain" کہتے ہیں۔ اس کاروبار میں پہلے تخمینہ اور اندازہ لگانا ہوتا ہے کہ کونسے شیئرز کی قیمتیں آئندہ کم ہوں گی اور کونسے شیئرز کی قیمتیں بڑھیں گی، اس عملِ تخمین کو "Speculation" کہتے ہیں، یہ اندازہ کبھی صحیح ثابت ہوتا ہے اور کبھی غلط۔

شیئرز کی خرید وفروخت کا طریقِ کار

شیئرز کی خریداری کے تین طریقے ہیں:-

۱- حاضر سودا (Spot Sale):- یہ خرید و فروخت کا عام سادہ اندازہ ہے کہ کسی نے شیئرز دے کر ان کی قیمت وصول کرلی، اس حاضر سودے میں بھی شیئرز کے سرٹیفکیٹ پر قبضہ عموماً ایک ہفتے کے بعد ہوتا ہے۔

۲- (Sale On Margin):- اس سے مراد شیئرز کی ایسی خریداری ہے جس میں شیئرز کی قیمت کا کچھ فیصد حصہ فی الحال ادا کردیا جائے، باقی اُدھار ہو، مثلاً دس فیصد قیمت ادا کردی اور ۹۰ فیصد اُدھار ہے ـــــ اس کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے

کہ جو لوگ اکثر شیئرز خریدتے رہتے ہیں ان کے دلالوں سے تعلقات ہوتے ہیں، اب کوئی شخص دلال سے کہتا ہے کہ فلاں کمپنی کے شیئرز Margin پر خرید لو، جس کی شرح طے کر لی جاتی ہے، مثلاً دس فیصد، اتنی رقم تو خریدار دے دیتا ہے، باقی ۹۰ فیصد دلال اپنی طرف سے ادا کرتا ہے، یہ رقم دلال کا قرض ہوتا ہے خریدار کے ذمے۔ دلال کبھی اس پر سود لیتا ہے اور کبھی نہیں، اور کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ چند دن تک تو مہلت بلا سود ہے، اس کے بعد سود ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، مثلاً اگر باقی ماندہ قیمت تین دن تک ادا کردی تو سود نہیں ہوگا، لیکن اس کے بعد سود لگے گا۔ اس میں دلال کا اصل فائدہ کمیشن ہوتا ہے، اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لئے اور کمیشن لینے کے لئے وہ قرض دینے کو بھی تیار ہوتا ہے۔

۳- شارٹ سیل (Short Sale):- درحقیقت ''بیع غیر مملوک'' کا نام ہے، یعنی بائع ایسے شیئرز فروخت کردیتا ہے جو ابھی اس کی ملکیت میں نہیں ہوتے، لیکن اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ سودا ہو جانے کے بعد میں یہ شیئرز لے کر خریدار کو دے دوں گا۔

حاضر اور غائب سودے

شیئرز کے سودے دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک کو حاضر سودا (Spot Sale) کہتے ہیں، اور دوسرے کو غائب سودا (Forward Sale) کہتے ہیں۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ابھی ہو جاتی ہے اور حقوق کی منتقلی بھی ابھی ہو جاتی ہے، خریدار ابھی سے شیئرز لینے کا حق دار ہوتا ہے، مگر بعض انتظامی مجبوریوں کی بنا پر شیئرز کے سرٹیفکیٹ کی ادائیگی (ڈیلیوری) میں تاخیر ہوتی ہے، عموماً ایک سے تین ہفتوں تک تاخیر ہو جاتی ہے، لیکن زیادہ تر یہ تاخیر رجسٹرڈ شیئرز کی ادائیگی میں ہوتی ہے، جن پر حامل کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے، حامل کا نام بدلنے کے لئے کمپنی کی طرف رُجوع کرنا پڑتا ہے اس کی وجہ سے تاخیر ہو جاتی ہے۔ بیئرر شیئرز میں زیادہ تاخیر نہیں ہوتی ہے ـــــ حاضر سودے میں بھی چونکہ شیئرز پر قبضہ ہونے میں تاخیر ہو جاتی ہے، اس لئے یہاں بھی خریدار شیئرز کے سرٹیفکیٹ کو اپنی تحویل میں لینے سے پہلے آگے بیچ

دیتا ہے، بسااوقات قبضے کا وقت آنے پر اس کی کئی ہاتھوں میں بیع ہوچکی ہوتی ہے۔

حاضر سودے میں شیئرز کی بیع ہوجانے کے بعد قبضے سے پہلے اگر کمپنی نفع تقسیم کردے تو کمپنی نفع بائع کے نام ہی جاری کرتی ہے، لیکن طریق کار یہی ہے کہ چونکہ بیع ہونے کے بعد نفع تقسیم ہوا ہے، اس لئے بائع وہ نفع خریدار کو دے دیتا ہے۔

غائب سودے میں بیع تو ابھی ہوجاتی ہے، مگر مستقبل کی طرف مضاف ہوتی ہے، جیسے ابھی شیئرز کی بیع ہوچکی ہے، مگر قبضے وغیرہ کے حقوق فلاں تاریخ سے متعلق ہوں گے۔ غائب سودے میں جب وہ تاریخ آتی ہے جس پر شیئرز کی ادائیگی طے کی گئی تھی تو بعض اوقات شیئرز خریدار کے حوالے کردیئے جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ بائع اور خریدار شیئرز لینے کے بجائے خریداری کی تاریخ کی قیمت اور ادائیگی کی تاریخ کی قیمت کا فرق آپس میں برابر کرلیتے ہیں۔ مثلاً یکم جنوری کو ۳۰؍مارچ کی تاریخ کے لئے غائب سودا کیا گیا تھا، اور فی شیئر دس روپے قیمت مقرر ہوئی تھی، لیکن جب ۳۰؍مارچ کی تاریخ آئی تو شیئر کی قیمت بڑھ کر بارہ روپے ہوگئی، اب بائع خریدار کو شیئرز دینے کے بجائے دو روپے فی شیئر ادا کردیتا ہے، یا اگر قیمت آٹھ روپے رہ گئی تو خریدار بجائے اس کے کہ بائع کو دس روپے دے کر اس سے شیئرز وصول کرے، اسے فی شیئر دو روپے دے دیتا ہے اور شیئرز وصول نہیں کرتا۔ پھر غائب سودے میں سودے کی تاریخ کے بعد ادائیگی کی تاریخ آنے تک بعض اوقات بہت سے سودے ہوجاتے ہیں، یعنی پہلا خریدار دُوسرے کو، دُوسرا تیسرے کو بیچتا رہتا ہے، اور بعض اوقات آخر میں سب شیئرز کے لین دین کے بجائے قیمتوں کا فرق برابر کرلیتے ہیں۔

اَجناس میں حاضر اور غائب سودے

بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے جیسے شیئرز کے حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں ایسے ہی اَجناس اور اشیاء کے بھی حاضر اور غائب سودے ہوتے ہیں، یہ سودے چند منتخب بڑی بڑی اَجناس میں ہوتے ہیں، مثلاً گندم، کپاس وغیرہ۔

اَجناس کا حاضر سودا تو یہ ہوتا ہے کہ کسی جنس کی ابھی بیع ہوئی اور حقوق بھی منتقل ہوگئے اور خریدار ابھی سے قبضے کا حق دار قرار پایا، کسی اِنتظامی مجبوری کی بنا پر قبضے میں تاخیر ہو تو وہ الگ بات ہے، مگر وہ حق دار قبضے کا بن چکا ہے۔

غائب سودا یہ ہے کہ بیع تو ہوگئی، مگر قبضے کے لئے کوئی آئندہ تاریخ مقرّر ہوجاتی ہے، اُصولی طور پر اس کو "Forward Sale" بھی کہتے ہیں اور "Future Sale" بھی کہتے ہیں، مگر آج کل عملی طور پر ان دونوں میں فرق ہوتا ہے، غائب سودے میں اگر جانبین کا مقصد مقرّرہ تاریخ پر لینا، دینا ہی ہو، یعنی مشتری کا مقصد جنس وصول کرنا اور بائع کا مقصد قیمت لینا ہو تو اس کو "Forward Sale" کہتے ہیں، اور اگر جانبین کا مقصد مقرّرہ تاریخ پر قیمت لینا، دینا نہ ہو بلکہ جنس کو محض معاملے کی بنیاد کی حیثیت سے اِختیار کیا گیا ہو اس کو "Future Sale" کہتے ہیں، اور عربی میں اس کو "مستقبلیات" کہتے ہیں۔ اس میں جنس کا لینا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ مقصد دو باتوں میں سے ایک بات ہوتی ہے:-

۱- سٹہ (Speculation):- تاریخِ مقرّرہ پر جنس لینے، دینے کی بجائے قیمتوں کا فرق برابر کرکے نفع کمایا جاتا ہے۔ مثلاً یکم دسمبر کو یہ معاملہ طے ہوا کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں ایک لاکھ روپے میں دینی ہوں گی، مگر نہ بائع کا مقصد کپاس دینا ہوتا ہے اور نہ مشتری کا مقصد کپاس لینا ہوتا ہے، بلکہ تاریخ آنے پر دونوں آپس میں نفع یا نقصان برابر کرلیتے ہیں، اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت ایک لاکھ دس ہزار ہوگئی تو بائع مشتری کو دس ہزار دے کر معاملہ صاف کرلے گا، اور اگر یکم جنوری کو قیمت ۹۰ ہزار ہوگئی تو بائع مشتری سے دس ہزار لے کر معاملہ صاف کرلے گا۔

۲- "Future Sale" کا دُوسرا مقصد ممکنہ نقصان سے تحفظ ہوتا ہے، اس کو "Hedging" کہتے ہیں، عربی میں اس کو "تأمین ضد الخسارة" کہا جاسکتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی جنس کا غائب سودا (Forward Sale) کرتا ہے اور اس کا مقصد واقعی جنس وصول کرنا ہی ہوتا ہے، سٹہ مقصود نہیں ہوتا، لیکن خریدار یہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ اگر مقرّرہ تاریخ تک اس جنس کی قیمت گرگئی تو مجھے نقصان ہوگا، وہ

اس نقصان سے بچنے کے لئے اس جنس کو "Futures Market" میں اسی تاریخ کے لئے "Future" پر فروخت کرتا ہے تاکہ اگر اس جنس کی قیمت گر گئی تو پہلے معاملے میں جتنا نقصان ہوگا اتنا ہی دُوسرے معاملے میں وصول ہو جائے گا۔

مثلاً زید نے یکم دسمبر کو کپاس کی سو گانٹھ ایک لاکھ روپے میں خریدیں، قبضہ یکم جنوری کو طے ہوا، اس کا خیال یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی سو گانٹھیں لے کر آگے بیچ کر نفع کماؤں گا، مگر خطرہ یہ ہے کہ یکم جنوری کو کپاس کی قیمت گر گئی تو اس کو نقصان ہوگا۔ زید اس نقصان سے بچنے کے لئے یہ کارروائی کرتا ہے کہ کپاس کی سو گانٹھیں یکم جنوری تک ایک لاکھ روپے میں "Futures" مارکیٹ میں خالد کو بیچ دیتا ہے، اب اگر یکم جنوری کو سو گانٹھوں کی قیمت ۹۰ ہزار ہوگئی تو زید کو دس ہزار کا خسارہ ہوا، مگر اتنی ہی گانٹھیں چونکہ اس نے خالد کو "Futures" کے بازار میں بیچی ہوئی ہیں، اس لئے یکم جنوری کو وہ ۹۰ ہزار میں دُوسری گانٹھیں خرید کر خالد کو ایک لاکھ میں فروخت کر دے گا، اور اس طرح پہلے معاملے میں زید کو جو دس ہزار کا خسارہ ہوا تھا وہ اس نے خالد کے ساتھ کئے ہوئے معاملے سے وصول کر لیا۔۔۔۔۔۔ ''فیوچر سیلز'' اس طرح نقصان سے بچنے کے لئے بھی ہوتی ہے، اسی کو "Hedging" (ہیجنگ) کہتے ہیں۔

"Futures" وغیرہ کا کاروبار بعض ممالک میں اسٹاک ایکسچینج ہی میں ہوتا ہے، اور بعض ممالک میں اس کا الگ بازار ہوتا ہے۔

بیع الخیارات (Options)

کسی خاص چیز کو خاص قیمت پر بیچنے یا خریدنے کے حق کا نام ''خیارات'' یا "Options" ہے۔ کوئی شخص دُوسرے سے وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم چاہو گے تو فلاں چیز اتنی قیمت میں اتنی مدّت تک میں خریدنے کا معاہدہ کرتا ہوں، تم جب چاہو بیچ سکتے ہو، اس کو بیچنے کا آپشن کہتے ہیں۔

"Option" دینے والا یہ حق دینے پر فیس لیتا ہے، "Option" دینے والا اس مدّت میں اس چیز کو اسی قیمت پر خریدنے کا پابند ہوتا ہے، لیکن "Option" لینے

والا بیچنے کا پابند نہیں ہوتا، اسی طرح اس کے برعکس بعض اوقات ایک شخص یہ وعدہ کرتا ہے کہ میں تم سے فلاں چیز فلاں تاریخ تک فلاں نرخ پر بیچنے کی ذمہ داری لیتا ہوں، اس تاریخ تک تم جب چاہو مجھ سے اس نرخ پر یہ چیز خرید لینا، یہ خریداری کا آپشن ہے ــــ "Option" کرنسی پر بھی ہوتا ہے اور اجناس پر بھی ہوتا ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ "Option" دینے والا لینے والے کو اس کرنسی یا جنس کی قیمتوں کے اُتار چڑھاؤ سے مطمئن کرتا ہے اور یہ اطمینان دلانے پر کمیشن لیتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے ۲۵ روپے کا ایک ڈالر خریدا، وہ اس کشمکش میں ہے کہ اگر یہ اپنے پاس رکھوں تو اس کی قیمت گرنے کا احتمال ہے، اگر ابھی آگے فروخت کردوں تو ہوسکتا ہے کہ آئندہ اس کی قیمت بڑھ جائے تو نفع سے محروم رہوں گا۔ اب دُوسرا شخص اس کو اطمینان دِلاتا ہے کہ ڈالر تم اپنے پاس رکھو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تین ماہ تک یہ ڈالر میں ۲۵ روپے میں خریدوں گا، اور اس وعدے پر اتنی فیس لوں گا۔ اس کی وجہ سے وہ شخص قیمت گرنے سے مطمئن رہے گا، اگر قیمت بڑھ گئی تو کسی اور کو فروخت کردے گا، قیمت گرگئی تو "Option" بیچنے والے کو ۲۵ روپے میں فروخت کردے گا۔

"Option" کو مستقل مالِ تجارت سمجھا جاتا ہے، اور اس کی آگے بھی بیع ہوجاتی ہے، یہ کاروبار دُوسرے ممالک میں بہت وسیع پیمانے پر ہورہا ہے، اور اس کی صورتیں روز بروز پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہیں۔

السوق المالية (Financial Market)

اسٹاک ایکسچینج ایک بڑے بازار کا حصہ ہے جس کو "السوق المالية"، "Financial Market" یا "Capital Market" کہتے ہیں۔ جس میں صرف کمپنیوں کے شیئرز ہی نہیں، بلکہ دُوسرے اداروں (بینک، دیگر مالیاتی ادارے، حکومت وغیرہ) کی جاری کردہ مالیاتی دستاویزات کی خرید وفروخت بھی ہوتی ہے، گواس بازار کا کوئی الگ جغرافیائی وجود ضروری نہیں، عملاً یہ سب کام اسٹاک ایکسچینج میں ہی ہوسکتے ہیں، مگر اصطلاح میں اس کا معنوی تصوّر ہے، اسی "Financial Market" میں "سرکاری

تمسکات'' (Government Securities) کی بیع و شراء بھی ہوتی ہے۔ ''سرکاری تمسکات'' ان دستاویزات کو کہتے ہیں جو حکومت وقتاً فوقتاً عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے، جب حکومت کے ذرائع آمدنی (ٹیکس وغیرہ) بجٹ کے لئے ناکافی ہوں، تو حکومت یہ مالیاتی دستاویز عوام سے قرض لینے کے لئے جاری کرتی ہے، مثلاً:-

۱- اِنعامی بانڈ:- جس میں ہر بانڈ پر تو نفع نہیں ہوتا، تمام بانڈز سے حاصل ہونے والی رُقوم پر مجموعی طور پر نفع ہوتا ہے جو قرعہ اندازی سے تقسیم ہوتا ہے۔

۲- ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ

۳- خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ

۴- فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ:- پہلے عوام کو اپنے پاس فارن ایکسچینج (بیرونی کرنسی) اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں تھی، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب کسی کو فارن ایکسچینج کی ضرورت پیش آتی تو اس میں بہت سی قانونی مشکلات ہوتی تھیں، اس صورتِ حال کا ایک نقصان یہ تھا کہ لوگ غیرقانونی ذرائع سے فارن ایکسچینج حاصل کرتے اور اپنے پاس رکھتے تھے۔ دُوسرا نقصان یہ تھا کہ لوگ باہر سے فارن ایکسچینج مثلاً ڈالر لاتے تو وہ حکومت کو نہیں دیتے تھے، جبکہ حکومت کو اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کو قانونی شکل دے کر لوگوں سے فارن ایکسچینج بطورِ قرض لینے کے لئے جو دستاویز حکومت نے جاری کی اس کو ''فارن ایکسچینج بیئرر سرٹیفکیٹ'' (I.E.B.C) کہتے ہیں ــــــ اس کی شکل یہ ہے کہ حکومت ڈالر لے کر اس وقت کی قیمت کے مطابق پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کردیتی ہے، مثلاً اس وقت ڈالر کی قیمت ۲۵ روپے ہے اور باہر سے آنے والا سو ڈالر لے کر آیا تو حکومت اس سے سو ڈالر لے کر اس کو دو ہزار پانچ سو پاکستانی روپے کا سرٹیفکیٹ جاری کرے گی، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ حکومت حاملِ سرٹیفکیٹ کے لئے پاکستانی ڈھائی ہزار روپوں کی مقروض ہے۔

ایف.ای.بی.سی پر سالانہ ۱۴فیصد اضافہ ملتا ہے، اور اس کا حامل جب چاہے یہ سرٹیفکیٹ پیش کرکے دوبارہ ڈالر لے سکتا ہے، اور حامل اس سرٹیفکیٹ کو بیچ بھی سکتا ہے۔

یہ تمام سرکاری تمسکات ہیں، ان میں اصل معاملہ تو حکومت اور قرض دہندہ (حاملِ دستاویز) کے درمیان ہوتا ہے، لیکن عوام کی سہولت کے لئے ان کے بیچنے کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ "Financial Market" میں ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے، حاملِ دستاویز جب اس کی بیع کرے گا تو اب وہ دائن نہیں رہے گا، اس کا معاملہ حکومت سے ختم ہوجائے گا اور اب خریدار دائن ہوگا اور حکومت کا معاملہ خریدار سے وابستہ ہوجائے گا۔

شیئرز یا قرضے کی دستاویزات جہاں ان کے جاری کنندہ کے بجائے کسی تیسرے شخص کو فروخت کی جائیں، اس بازار کو ''ثانوی بازار'' (Secondary Market) کہا جاتا ہے۔ جن دستاویزات کا کوئی ثانوی بازار ہو، یعنی وہ کسی تیسرے فریق کو بیچی جاسکتی ہوں، ان کو زیادہ پُرکشش سمجھا جاتا ہے اور لوگ روپے کے عوض یہ دستاویزات لینے سے اس لئے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کہ جب چاہیں گے انہیں ثانوی بازار میں بیچ کر نقد رقم حاصل کرلیں گے۔

کمپنی پر ایک نظر شرعی حیثیت سے!

اب تک کمپنی کے بارے میں مروّجہ نظام کی تفصیل کا ذکر ہوا ہے۔ کمپنی کی یہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد اَب اس کی شرعی حیثیت پر گفتگو مناسب ہوگی۔ اس موضوع پر بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک حصہ اُصولی اور بنیادی طور پر کمپنی کے جواز یا عدمِ جواز کی بحث سے متعلق، اور دُوسرا حصہ کمپنی سے متعلق جزوی مسائل کا ہے۔

جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو پہلے واضح ہوچکی ہے کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں، ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اَقسام میں سے کسی میں داخل نہیں، فقہاء نے شرکت کی چار قسمیں ذکر کی ہیں، اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل کرلیا جائے تو پانچ قسمیں بن جاتی ہیں۔ کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں، جیسا کہ پہلے شرکت اور کمپنی میں فروق بتائے جاچکے ہیں ـــــ اب یہاں علمائے معاصرین کے تین نقطۂ نظر ہیں، ایک یہ کہ چونکہ شرعاً شرکت ان پانچ قسموں میں منحصر ہے اور کمپنی ان میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں، لہٰذا یہ جائز نہیں۔ دُوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ محض اس بنا پر کہ کمپنی ان پانچ قسموں میں داخل نہیں، اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اس لئے کہ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے جو اَقسام ذکر کی ہیں وہ منصوص نہیں، بلکہ فقہاء نے شرکت کی مروّجہ صورتوں کا استقراء کرکے اس کی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے۔ پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں کہیں یہ تصریح نہیں کہ جو صورت ان اَقسام سے خارج ہو وہ جائز نہیں ہوگی، لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اَقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اُصولِ منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطۂ نظر حضرت حکیم الأمت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، انہوں نے فرمایا ہے کہ اپنی حقیقی رُوح کے اعتبار سے کمپنی شرکتِ عنان میں داخل ہے۔ (امداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۹۴) اگرچہ کمپنی کی بعض ایسی خصوصیات ہیں جو معروف شرکت عنان میں نہیں پائی جاتیں، لیکن ان کی وجہ سے عنان کی حقیقت تبدیل نہیں ہوتی۔ اب کمپنی کی شرعی حیثیت پر گفتگو کے لئے اس کی خصوصیات پر الگ الگ غور کرنا ہوگا کہ وہ شریعت کے مطابق ہیں یا نہیں؟ ان خصوصیات میں سے اکثر انتظامی نوعیت کی ہیں، جو شرعاً قابلِ اعتراض نہیں۔ البتہ کمپنی میں دو چیزیں شرعی اعتبار سے خاص طور پر قابلِ غور اور باعثِ تردّد ہیں، ان اُمور کے بارے میں احقر اپنی اب تک کی سوچ کا حاصل اہلِ علم کے غور و فکر کے لئے پیش کرتا ہے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، مگر کمپنی کا اپنا مستقل قانونی وجود ہوتا ہے جس کو ''شخصِ قانونی'' کہا جاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ شخصِ قانونی کا تصوّر شرعاً دُرست ہے یا نہیں؟ ـــــــ جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں گو ''شخصِ قانونی'' کی اِصطلاح موجود نہیں، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں۔

''شخصِ قانونی'' کے نظائر

۱- **وقف:** اس کے لئے اگرچہ شخصِ قانونی کی اِصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخصِ قانونی ہے، اس لئے کہ وقف مالک ہوتا ہے، مسجد یا وقف کو چندہ دیا جائے یا کوئی اور چیز دی جائے تو وہ چندہ یا دیگر عطیات وقف نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے وقف ہونے کی تصریح نہ کردی جائے، بلکہ وقف کے مملوک ہوتے ہیں اور وقف مالک ہوتا ہے۔ وقف دائن بھی ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص وقف کی زمین کرایہ پر لیتا ہے تو یہ کرایہ وقف کا دین ہے اور وقف دائن ہے۔ ایسے ہی وقف مدیون بھی ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص وقف کا ملازم ہے تو اس کی تنخواہ وقف کے ذمے دَین ہے،

عدالت میں مقدمہ ہو تو وقف مدعی اور مدعا علیہ بھی ہوسکتا ہے، اور متولّی اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ مالک ہونا، دائن ہونا، مدیون ہونا، مدعی یا مدعا علیہ ہونا شخص کے اوصاف میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ وقف میں ”شخصِ قانونی“ کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں، گو فقہاء نے یہ اِصطلاح استعمال نہیں کی۔

۲- بیت المال: بیت المال کے مال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہے، مگر ہر شخص اس مال میں مِلک کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال بھی ایک ”شخصِ قانونی“ ہے، بلکہ فقہاء کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیت المال کی ہر مد ایک مستقل ”شخصِ قانونی“ ہے۔ بیت المال کے دو الگ الگ حصے ہیں، بیت مال الصدقہ، اور بیت مال الخراج، اِمام زیلعی رحمۃ اللہ علیہ[1] نے مسئلہ لکھا ہے کہ اگر ایک حصے میں مال نہ ہو تو بوقتِ ضرورت دُوسرے حصے سے قرض لیا جاسکتا ہے۔ تو اس صورت میں جس حصے سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصے کے لئے قرض لیا گیا وہ مدیون ہوگا۔ دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی ”شخص“ فرض کرلیا گیا ہے۔

۳- ترکة مستغرقة بالدّین: کسی میّت کا سارا ترکہ دیون سے مستغرق ہو تو اس صورت میں دائنین کا مدیون نہ میّت ہے، اس لئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا، اور نہ ورثہ مدیون ہیں، اس لئے کہ ان کو تو میراث ملی ہی نہیں، لہٰذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا جو ”شخصِ قانونی“ ہے۔

۴- خلطة الشیوع: یہ نظیر حنفیہ کے مذہب کے مطابق نہیں، بلکہ اَئمہ ثلاثہؒ کے مذہب کے مطابق ہے، ان کے ہاں مالِ زکوٰۃ کئی شخصوں میں مشاع طور پر مشترک ہو تو زکوٰۃ اِنفرادی حصوں پر نہیں، بلکہ مجموعے پر ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اَئمہ ثلاثہ نے ہاں مجموعہ ایک [illegible] قانونی ہے۔ ـــ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ”خلطة الشیوع“ اور کمپنی کے نظام میں یہ فرق ہے کہ ”خلطة الشیوع“ میں ائمہ ثلاثہؒ کے ہاں مجموعے پر زکوٰۃ ہوتی ہے، پھر ہر شریک کی اِنفرادی ملکیت پر زکوٰۃ

---

(۱) تبیین الحقائق، کتاب السیر، قبیل باب المرتدین ج:۳ ص:۲۸۳۔

نہیں ہوتی، اور کمپنی کے نظام میں کمپنی پر الگ ٹیکس ہوتا ہے، اور شیئر ہولڈرز پر الگ ٹیکس ہوتا ہے۔

ان نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ ''شخصِ قانونی'' کا تصور فی نفسہٖ کوئی ناجائز تصور نہیں ہے، اور نہ فقہِ اسلامی کے لئے کوئی اجنبی تصور ہے، البتہ یہ اِصطلاح ضرور نئی ہے۔

محدود ذمہ داری کی شرعی حیثیت

کمپنی کی دُوسری خصوصیت جو شرعی اِعتبار سے قابلِ غور ہے وہ "Limited Liabilitiy" یعنی ''محدود ذمہ داری'' ہے، جس کی تشریح پیچھے کی جاچکی ہے۔۔۔۔۔۔ اس میں جہاں تک شیئرز ہولڈرز کی محدود ذمہ داری کا تعلق ہے، اس کی تو شرعی نقطۂ نظر سے ایک نظیر موجود ہے، اس لئے کہ جب تک رَبّ المال مضارب کو دُوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے، مضاربت میں بھی رَبّ المال کی ذمہ داری اس کے سرمائے تک محدود ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر رَبّ المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید قرض لینے کی اجازت نہیں دی، پھر کاروبار کے نتیجے میں مضارب پر دیون واجب ہوگئے تو ایسی صورت میں رَبّ المال کا زیادہ سے زیادہ اس کے سرمائے کی حد تک نقصان ہوگا، اس سے زیادہ کا رَبّ المال سے مطالبہ نہیں ہوگا، بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہوگا، کیونکہ اس نے رَبّ المال کی اجازت کے بغیر قرضے لئے ہیں اس لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے۔ ایسے ہی شیئرز ہولڈر جو خود عمل نہ کر رہا ہو تو اس کی ذمہ داری کے محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اُصول پر صحیح معلوم ہوتی ہے۔ البتہ یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ تقریباً تمام کمپنیوں کے پراسپکٹس میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ کمپنی ضرورت کے مواقع پر بینکوں وغیرہ سے قرض لے سکے گی، اور جو لوگ کمپنی کے شیئر ہولڈرز بنتے ہیں، ان کو یہ بات معلوم ہوتی ہے، لہٰذا جب وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں تو ان کی طرف سے گویا معنوی اجازت ہے کہ کاروبار کے لئے قرض لیا جاسکتا ہے، اور جب رَبّ المال مضارب کو قرض کی اجازت دیدے تو اس کی ذمہ داری محدود نہیں رہتی۔ لیکن اس شبہ کا یہ جواب ہوسکتا ہے کہ پراسپکٹس

ہی میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی، جس کا مطلب یہ ہوا کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرض لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمائے سے زیادہ نہ ہو، لہٰذا اس کی صحیح نظیر یہ ہے کہ رَبّ المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرض لینے کی اجازت دے کہ اس کی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔

لیکن یہاں شرعی نقطۂ نظر سے اصل اِشکال یہ ہے کہ مضاربت میں رَبّ المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے، مگر مضارب کی ذمہ داری محدود نہیں ہوتی، لہٰذا دائنین رَبّ المال کے سرمائے سے زائد دیون مضارب سے وصول کرسکتے ہیں، چنانچہ دائنین کا ذمہ خراب نہیں ہوتا، لیکن کمپنی میں ڈائریکٹران کی ذمہ داری بھی محدود ہے، اور خود کمپنی جو شخصِ قانونی ہے اس کی ذمہ داری بھی محدود ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کمپنی کے اثاثوں سے زائد دائنین کا جو دَین ہوگا اس کی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں رہے گی، دائنین کا ذمہ خراب ہوجائے گا، "خراب الذمة" فقہاء کی اِصطلاح ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دائن کا دَین ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہے۔

اسی اِشکال کی بنا پر بعض علمائے عصر کی رائے یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصوّر شرعاً صحیح نہیں، اس لئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں۔ کم از کم ڈائریکٹران کی ذمہ داری غیرمحدود ہونی چاہئے۔ لیکن اس مسئلے کو اگر ایک دُوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصوّر کی بنیاد دراصل شخصِ قانونی کے تصوّر پر ہے۔ شخصِ قانونی کو حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا۔ شخصِ حقیقی مفلس (دِیوالیہ) ہوجائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں سے دَین وصول کرسکتے ہیں، اس سے مزید کا مطالبہ نہیں کرسکتے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی تفلیس فرمانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دائنین کو فرمایا تھا: "خذوا ما وجدتم، لیس لکم اِلّا ذٰلک"[1] البتہ

(۱) صحیح مسلم ج:۱ ص:۲۱۹، ادارۃ القرآن، کتاب باب وضع الجوائح۔

اگر وہ دوبارہ غنی ہوجائے تو اَب پھر مطالبہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اس کی موت واقع ہوجائے تو ''خراب الذمۃ'' ہوجاتا ہے، ان کے دیون ادا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ معلوم ہوا کہ شخصِ حقیقی اگر مفلس ہوکر مرجائے تو اس کی ذمہ داری اثاثوں تک محدود ہوتی ہے اور دائنین کا ذمہ خراب ہوجاتا ہے۔ جب کمپنی کو بھی شخص مان لیا گیا ہے تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہوکر تحلیل ہوجائے تو اس کی ذمہ داری بھی اثاثوں تک محدود ہونی چاہئے، اس لئے کہ کمپنی کا تحلیل ہوجانا ہی اس شخصِ قانونی کی موت ہے۔

خصوصاً جبکہ کمپنی کے ساتھ معاملہ کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے، میرا حق صرف اثاثوں کی حد تک محدود ہوگا، یہی وجہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ ''لمیٹڈ'' لکھنا ضروری ہوتا ہے، پھر کمپنی کی بیلنس شیٹ بھی شائع ہوتی رہتی ہے، قرض دینے والا بیلنس شیٹ کے ذریعے سے کمپنی کا مالی اِستحکام دیکھ کر قرض دیتا ہے، غرضیکہ جو شخص بھی لمیٹڈ کمپنی سے معاملہ کرتا ہے وہ علیٰ بصیرۃ کرتا ہے، اس میں کسی قسم کا دھوکا یا فراڈ نہیں ہوتا، اس لئے اکثر علمائے عصر کی رائے یہی ہے کہ محدود ذمہ داری کے تصوّر کی وجہ سے شرکت کو فاسد نہیں کہا جاسکتا ہے۔

لمیٹڈ کمپنی کی فقہی نظیر

فقہ میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دِلچسپ نظیر موجود ہے، جو لمیٹڈ کمپنی سے بہت ہی قریب ہے، وہ ''عبد ماذون فی التجارۃ'' ہے، یہ اپنے آقا کا مملوک ہوتا ہے اور اس کو آقا کی طرف سے تجارت کی اجازت ہوتی ہے، جو تجارت وہ کرتا ہے وہ بھی مولیٰ کی مملوک ہوتی ہے، اس پر اگر دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوں گے، اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہوسکتا ہے اور نہ مولیٰ سے۔ یہاں بھی دائنین کا ذمہ خراب ہوگیا، یہ نظیر لمیٹڈ کمپنی سے زیادہ قریب اس لئے ہے کہ جیسے کمپنی میں شیئر ہولڈرز کے زندہ ہوتے ہوئے ذمہ خراب ہوجاتا ہے، ایسے ہی یہاں بھی مولیٰ کے زندہ ہوتے ہوئے دائنین کا ذمہ خراب ہوجاتا ہے۔

کمپنی کے چند جزوی مسائل

"Under Writing" کی شرعی حیثیت

"ضمان الاکتتاب" (Under Writing) کی تشریح شروع میں گزر چکی ہے کہ اس میں کوئی ادارہ نئی قائم ہونے والی کمپنی کے لئے یہ ضمانت لیتا ہے کہ اگر اس کے جاری کردہ شیئرز لوگوں نے نہ لئے تو وہ خود لے لے گا اور اس ضمانت پر اُجرت وصول کرتا ہے۔ اس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں: ایک یہ کہ "Under Writer" جو ضمانت لیتا ہے اس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ ضمانت فقہی نقطۂ نظر سے ضمانت یا کفالت نہیں ہے، اس لئے کہ کفالت یا ضمانت تو ایسے دَین کے بارے میں ہوتی ہے جو واجب ہو، شیئرز لینا واجب نہیں، اس لئے شیئرز لینے کا ضامن بننا ضمانت یا کفالت نہیں، بلکہ ایک وعدہ ہے یا مالکیہ کی اِصطلاح میں اس کو "اِلتزام" کہا جاسکتا ہے۔ (''اِلتزام'' اپنے اُوپر کسی چیز کو لازم کرلینا، یہ مالکیہ کے ہاں ایک مستقل باب ہے) اور وعدہ حنفیہ کے ہاں دیانۃً لازم ہوتا ہے، قضاءً لازم نہیں ہوتا، البتہ مالکیہ کے ہاں بعض صورتوں میں لازم ہوجاتا ہے، لہٰذا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مالکیہ کا قول اِختیار کرتے ہوئے یہ وعدہ لازم ہوگا۔

دُوسرا مسئلہ اس کمیشن کا ہے جو "Under Writing" پر لیا جاتا ہے، اس کمیشن کے لینے کے جواز کی کوئی صورت نہیں، اس لئے کہ یہ کمیشن بلاعوض ہے جو فقہ میں رِشوت کہلاتا ہے، جب وہ شیئرز لے گا تو کمپنی کا شریک بن جائے گا اور شریک بننے پر رقم لینے کا کوئی جواز نہیں۔ تاہم چند باتیں ایسی ہیں جن پر "Under Writer" اُجرت لے سکتا ہے۔ مثلاً "ضمان الاکتتاب" سے پہلے ضمانت دینے والے کو کمپنی کے بارے میں کئی چیزوں کا جائزہ لینا پڑتا ہے، مثلاً کمپنی کیا کاروبار کرے گی، کون لوگ کمپنی کو لے کر چلیں گے، نفع نقصان کے کیا اِمکانات ہیں؟ اس کو ''دِراسات'' (Studies) کہتے ہیں۔ ضمانت دینے والا ان دِراسات کا حقیقی خرچ لے سکتا ہے، ایسے ہی اس ضمانت کے انداز کو تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے، وہ اس طرح کہ بینک اس

بات کی ضمانت دینے کی بجائے کہ میں حصے خریدلوں گا، اس بات کا معاہدہ کرے کہ جو شیئرز نہیں خریدے جائیں گے میں ان کے خریدار مہیا کروں گا۔ یہ ایسا عمل ہے جو سمسرہ کے قبیل سے ہے، اس پر اُجرت لینا جائز ہے، اس تبدیلی میں کوئی خاص عملی مشکل بھی نہیں، اس لئے کہ مروّجہ صورت میں بھی بینک عملاً یہی کرتا ہے کہ شیئرز اپنے پاس نہیں رکھتا، بلکہ دُوسرے لوگوں کو بیچ دیتا ہے۔

واضح رہے کہ بعض معاصرین نے **"ضمان الإکتتاب"** (Under Writing) پر اُجرت لینے کے لئے یہ تجویز پیش کی ہے کہ **"ضامن الإکتتاب"** (Under Writer) کو اُجرت دینے کے بجائے اس کو حصے کم قیمت پر فروخت کردیئے جائیں، مثلاً دس روپے کا حصہ ساڑھے نو روپے میں دے دیا جائے، لیکن درحقیقت یہ صورت بھی شرعاً جائز نہ ہوگی، کیونکہ حصہ لینے کا مطلب کمپنی کے ساتھ شرکت قائم کرنا ہے، اور اگر دس روپے کا حصہ ساڑھے نو روپے میں دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ضامن ساڑھے نو روپے میں دس روپے کے اثاثوں کا مالک بن جائے گا جو شرکت کے آغاز میں جائز نہیں ہے۔

شیئرز کی شرعی حیثیت اور ان کی خرید و فروخت

بعض علمائے معاصرین (جو بہت کم ہیں) کی رائے یہ ہے کہ یہ شیئر کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، بلکہ یہ محض اس بات کی دستاویز ہے کہ اس شخص نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے، جیسے دیگر قرضوں کی دستاویزات ہوتی ہیں، جیسے بانڈز وغیرہ، ایسے ہی یہ بھی ایک شہادۃ اور دستاویز ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ بانڈز وغیرہ پر معین شرح سے سود ہوتا ہے اور شیئرز پر سود کی شرح معین نہیں ہوتی، بلکہ کمپنی کو جو نفع ہوتا ہے، اسی کا ایک متناسب حصہ اس کو دے دیا جاتا ہے۔ اگر شیئر کمپنی کے اثاثوں میں ملکیت کی نمائندگی کرنے والا ہوتا تو شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں جہاں اس کی دوسری املاک کی قرقی ہوتی ہے، کمپنی میں اس کی متناسب ملکیت کی بھی قرقی ہونی چاہئے، مگر نہیں ہوتی، معلوم ہوا کہ کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتی۔

اس نقطۂ نظر کی بنا پر نہ شیئر لینا جائز ہے اور نہ اس کو کم دبیش پر آگے بیچنا اور خریدنا جائز ہے، اور چونکہ شیئر ہولڈر کی اثاثوں میں ملکیت نہیں، اس لئے ان کے پاس زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی۔

اس نقطۂ نظر پر کافی غور کیا گیا، لیکن یہ بات صحیح معلوم نہیں ہوتی ہے، کمپنی کے ظاہری تصور کے اعتبار سے اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی روشنی میں واقعتاً یہ سمجھا جاتا ہے کہ شیئر ہولڈر کی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر باہمی قرارداد سے کمپنی تحلیل ہوجائے تو شیئر ہولڈرز کو صرف ان کی لگی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی، بلکہ کمپنی کے اثاثوں کا متناسب حصہ ہر شیئر ہولڈر کو دیا جاتا ہے۔ جبکہ دوسری مالی دستاویزات مثلاً بانڈ وغیرہ پر کمپنی تحلیل ہونے کی صورت

ہیں صرف لگی ہوئی رقم مع سود واپس دی جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ شیئر محض قرضے کی شہادت نہیں، بلکہ یہ شیئرز کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈرز کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

شیئرز کی یہ حقیقت واضح ہوجانے کے بعد معلوم ہوا کہ شیئرز اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں، بلکہ اس کی پشت پر جو اَملاک اور اَثاثے ہیں وہ اصل چیز ہے، لہٰذا شیئرز کی خرید وفروخت دراصل کمپنی کے اثاثوں میں سے متناسب ملکیت کی خرید و فروخت ہے، اور کمپنی کے اثاثے مختلف صورتوں میں ہوتے ہیں۔ نقد، قابلِ وصول دیون، جامد اَثاثے، سامانِ تجارت وغیرہ، اور ہر قسم میں شیئر ہولڈرز کا متناسب حصہ ہوتا ہے، لہٰذا شیئر کی فروختگی کا مطلب یہ ہے کہ نقد، دیون، جامد اَثاثوں اور اَموالِ تجارت میں سے ہر ایک میں اپنی متناسب ملکیت کو فروخت کررہا ہے، شیئر کی خرید و فروخت کی اس حیثیت کے مطابق شیئر کی خرید وفروخت کی شرائط وتفصیلات یہ ہیں:۔

شیئرز کی بیع وشراء کی شرائط

۱۔ شیئرز کی کم وبیش پر خرید وفروخت کے جواز کی ایک شرط یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد اور دیون کی شکل میں نہ ہوں، اگر کمپنی نے ابھی تک کسی قسم کے جامد اَثاثے (مثلاً بلڈنگ، مشینری وغیرہ) یا سامانِ تجارت نہیں خریدے بلکہ اس کے پاس صرف نقود ہیں یا کسی کے ذمے دیون ہیں تو اس صورت میں شیئر کی بیع وشراء اس کی قیمتِ اسمیہ (Face Value) سے کم وبیش پر جائز نہیں۔ اس لئے کہ اب شیئر صرف نقد کی نمائندگی کررہا ہے، مثلاً دس روپے کا شیئر صرف دس روپے کی نمائندگی کر رہا ہے، اگر اس کو گیارہ روپے میں فروخت کیا جائے گا تو دس روپے کی بیع گیارہ روپے کے ساتھ ہوئی جو کہ ناجائز ہے۔

جب نقود کے علاوہ کمپنی کے دیگر اَثاثے بھی وجود میں آجائیں تو اَب اس کے اثاثے مخلوط ہوگئے، اس میں نقود اور غیر نقود دونوں شامل ہیں۔ اب شیئرز کی بیع کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثوں میں ہر ایک کے متناسب حصے کی بیع ہورہی ہے۔
اس مسئلے کا مدار اَب "مد عجوۃ" کے مسئلے پر ہوگا۔ "مد عجوۃ" اِمام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ

علیہ اور اِمام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان ایک اختلافی مسئلے کا عنوان ہے، جس کو "سیف محلّی" اور "منطقة مفضضة" سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ اس مسئلے کا حاصل یہ ہے کہ ایسے مال کو جو مالِ ربوی اور غیر ربوی سے مخلوط ہو، خالص مالِ ربوی سے بیچا جائے، جیسے تلوار پر سونا لگا ہوا ہو تو تلوار غیر ربوی اور سونا ربوی ہے، اس کی بیع دنانیر سے ہو تو اس کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟ اس میں اختلاف ہے، اِمام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں مخلوط کی خالص مالِ ربوی سے بیع جائز نہیں، جب تک مخلوط سے مالِ ربوی کو اَلگ نہ کرلیا جائے۔ اِمام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے ہاں یہ بیع جائز ہے بشرطیکہ خالص مالِ ربوی مخلوط میں شامل مالِ ربوی سے زیادہ ہو۔ مالِ ربوی کے مقابلے میں مالِ ربوی ہوگا اور زائد خالص مالِ ربوی غیر ربوی کے مقابلے میں ہوگا۔ البتہ بعض شافعیہ اور حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ اگر مخلوط میں اکثر مالِ ربوی ہو تو خالص مالِ ربوی سے بیع ناجائز ہے، اور اگر مخلوط غیر ربوی مال زیادہ اور مالِ ربوی کم ہو تو خالص مالِ ربوی سے بیع جائز ہے۔

بالکل یہی صورتِ حال یہاں ہے کہ نقود و غیر نقود کی بیع صرف نقود سے ہو رہی ہے، لہٰذا اِمام شافعی رحمہ اللہ کی رائے کے مطابق ایسی حالت میں شیئرز کی بیع جائز نہیں، اور بعض شافعیہ اور حنابلہ کے موقف کے مطابق اگر کمپنی کے اثاثے زیادہ ہیں اور نقود کم ہیں تو شیئر کی بیع جائز ہوگی۔ اور اگر نقود زیادہ اور دیگر اَثاثے کم ہیں تو شیئرز کی بیع ناجائز ہوگی۔

آج کل علمائے عرب میں سے اکثر یہی فتویٰ دے رہے ہیں، اس کی رُو سے شیئرز خریدنے سے پہلے کمپنی کے اثاثوں کا جائزہ لینا ضروری ہوگا کہ نقود زیادہ ہیں یا غیر نقود زیادہ ہیں؟ ــــــــــ لیکن حنفیہ کے ہاں اس تحقیق کی ضرورت نہیں، جب یہ تحقیق ہوجائے کہ کمپنی کے کچھ اثاثے غیر نقد بھی ہیں تو اَب لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ پر بیع و شراء جائز ہوگی۔ البتہ ہر شیئر کے حصے میں کمپنی کے نقود اور دیون کی جتنی مقدار آئی ہے، اگر شیئر کی کل قیمت اس کے برابر یا اس سے کم ہو تو بیع جائز نہ ہوگی، مثلاً دس روپے کے حصے میں اگر آٹھ روپے نقود و دیون کے مقابل ہیں، اور دو روپے بامد اَثاثوں کے مقابل، تو شیئر کی بیع آٹھ روپے یا اس سے

کم میں جائز نہ ہوگی، البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہوگی۔

۲- شیئرز کی خرید و فروخت کے جواز کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ کمپنی حلال کام کرتی ہو، اگر کمپنی کا اصل کاروبار ہی حرام ہو تو اس کے شیئر لینا جائز نہیں، مثلاً کوئی کمپنی شراب کا کاروبار کرتی ہو یا کمپنی کا اصل کاروبار ہی سود ہو، جیسے بینک وغیرہ۔

۳- بعض اوقات یہ صورت ہوتی ہے کہ کمپنی اصلاً تو حلال کاروبار کرتی ہے، مگر کسی نہ کسی طرح سود میں ملوّث ہوجاتی ہے، مثلاً بینک سے سود پر قرضہ لیتی ہے، یا زائد رقم بینک میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہے، یہ کمپنی کا اصل کاروبار نہیں، بلکہ ایک ذیلی اور ضمنی کام ہے۔ آج کل بیشتر کمپنیاں اسی نوعیت کی ہیں، ایسی کمپنیوں کے شیئرز لینے کا کیا حکم ہے؟ اس میں علمائے عصر کا اختلاف ہے، بعض علماء کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سودی کاروبار کمپنی اصلاً کر رہی ہو یا تبعاً، سودی کاروبار کم ہو یا زیادہ، ہر صورت میں چونکہ سودی کاروبار کر رہی ہے اور کوئی شخص اگر کمپنی کا شیئر لیتا ہے تو یہ کمپنی کو سودی کاروبار کا وکیل بنا رہا ہے، لہٰذا کمپنی کا سودی لین دین اس کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ اس لئے جو کمپنی کسی نہ کسی طرح سودی لین دین میں ملوّث ہو اس کے شیئرز لینا جائز نہیں، خواہ اس کا حقیقی کاروبار دُرست ہو ـــــ لیکن صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کے سودی لین دین کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کمپنی قرضہ لے اور اس پر سود اَدا کرے، اس صورت میں کمپنی کی آمدنی میں تو کوئی حرام عنصر شامل نہیں ہوا، اس لئے کہ جب کوئی شخص سود پر قرضہ لے تو یہ فعل تو حرام اور سخت گناہ ہے، مگر وہ قرض کا مالک بن جائے گا، اس کے ساتھ کاروبار کرکے جو آمدنی حاصل ہوگی وہ بھی حلال ہوگی۔ اس صورت میں زیادہ سے زیادہ اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ کمپنی چونکہ اس شیئر ہولڈر کی وکیل ہے، اس لئے سودی قرضے لینے کی نسبت اس کی طرف بھی ہوگی اور اس کو سودی قرضے لینے پر رضامند سمجھا جائے گا۔ اس کا جواب حضرت حکیم الاُمت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ دیا ہے کہ شیئر ہولڈر کسی طرح یہ آواز اُٹھادے کہ میں سودی کاروبار پر راضی نہیں ہوں تو اس کی ذمہ داری ختم ہوجائے گی۔ کمپنی کے ذمے داران کی طرف اس مضمون کا خط لکھ دینا بھی کافی ہوسکتا ہے۔[1] (آج کل اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ سالانہ جمعیت

(۱) اِمداد الفتاویٰ ج:۳ ص:۴۹۱۔

(A.G.M) میں اس کی آواز اُٹھائی جائے)۔ اس پر بھی اشکال ہوسکتا ہے جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر نہیں فرمایا، وہ یہ کہ کمپنی کے ذمہ داران شرکت کی وجہ سے اس کے وکیل تو بہرحال ہیں اور یہ معلوم ہے کہ جو آواز اُٹھائی جارہی ہے اس پر عمل نہیں ہوگا، تو وکالت کے ہوتے ہوئے ایسی غیر مؤثر آواز اُٹھانے سے وہ بری الذمہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کمپنی میں جو وکالت ہے یہ اس وکالت سے مختلف ہے جو شرکت (Partner Ship) میں ہوتی ہے۔ شرکت میں ہر شریک کی وکالت اس درجے قوی ہوتی ہے کہ ایک شریک بھی اگر کسی کاروبار سے اختلاف کردے تو وہ کاروبار نہیں کیا جاسکتا، شرکت میں فیصلے اتفاقِ رائے سے ہوتے ہیں، جبکہ کمپنی میں وکیل اور مؤکل کا رشتہ اس درجہ قوی نہیں ہوتا کہ ایک شیئر ہولڈر بھی اختلاف کردے تو فیصلہ نہ ہوپائے۔ کمپنی میں فیصلے اتفاقِ رائے سے نہیں ہوتے اور نہ اتفاقِ رائے سے کام چلانا ممکن ہے، یہاں فیصلے کثرتِ رائے سے ہوتے ہیں، اب جہاں فیصلے کثرت رائے سے ہوتے ہوں وہاں کوئی شخص سودی لین دین کے خلاف آواز اُٹھائے مگر اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اس پر عمل نہ ہو اور سودی لین دین بدستور جاری رہے تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سودی لین دین اس کے خلاف آواز اُٹھانے والے کی وکالت اور رضامندی سے ہورہا ہے ـــــ لہٰذا صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کمپنی کا اصل کاروبار تو جائز ہو اور ضمناً کبھی وہ سود پر قرضہ لیتی ہو تو اس کے شیئر لینا جائز ہے، بشرطیکہ سود سے براءۃ کی آواز اُٹھادی جائے۔

کمپنی کے سودی لین دین کی دُوسری صورت یہ ہے کہ کمپنی قرضہ دے کر سود لے، جیسا کہ آج کل بیشتر کمپنیاں زائد رقم بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹ میں رکھوا کر اس پر سود لیتی ہیں۔ یہاں دو اِشکال ہیں۔ ایک یہ کہ سودی معاملے میں شیئر ہولڈر کی بھی شرکت ہوجائے گی، اس کا حل تو وہی ہے جو اُوپر مذکور ہوا۔ دُوسرا اِشکال یہ ہے کہ کمپنی جو منافع (Dividend) تقسیم کرے گی اس میں سود بھی شامل ہوگا، آمدنی کا جو حصہ سود سے حاصل ہوا وہ حرام ہے۔ اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ایک یہ کہ ہمیں ہر کمپنی کے بارے میں یقین سے معلوم نہیں کہ اس نے سود لیا ہے، تعمق کے ہم مامور نہیں۔ دُوسری بات یہ کہ اگر بالفرض سود لیا بھی

ہو تو وہ قلیل ہے جو مالِ حلال میں مخلوط ہوگیا ہے۔ مالِ مخلوط میں اکثر حلال ہو تو اس کے استعمال کی گنجائش ہوتی ہے ـــــــ لیکن اس پر ایک اِشکال رہتا ہے کہ کوئی شخص مالِ مخلوط میں سے ہدیہ دے اور حرام حصہ اس مالِ مخلوط میں کم ہو تو ہدیہ لینا اس لئے جائز ہے کہ یہ سمجھا جائے گا کہ یہ حلال میں سے دے رہا ہے، لیکن کمپنی کے نفع (Dividend) کی صورت اس سے مختلف ہے، اس لئے کہ کمپنی کو جتنی مدات سے آمدنی حاصل ہوئی، ہر مد کی آمدنی کا ایک متناسب حصہ اس نفع (Dividend) میں شامل ہوتا ہے، لہٰذا سود کا ایک متناسب حصہ بھی نفع (Dividend) میں شامل ہے۔ اگر کمپنی کی آمدنی کا دس فیصد حصہ سودی اکاؤنٹ سے حاصل ہوا ہے تو نفع (Dividend) کا بھی دس فیصد حصہ سودی ہوگا۔ لہٰذا نفع (Dividned) کا جتنا حصہ سودی ہے اس کا بلانیتِ ثواب صدقہ کرنا لازمی ہوگا۔ یہ بات کہ آمدنی کا کتنا حصہ سودی ہے، کمپنی کے (Income Statements) سے معلوم کی جاسکتی ہے، اگر اس میں اس کی وضاحت نہ ہو تو کمپنی کے ذمے داران سے معلوم بھی کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ ـــــ یہ کہ کسی کمپنی کے شیئرز کی خرید و فروخت کی چار شرائط ہوئیں:۔

۱- کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو۔

۲- قیمتِ اسمیہ (Face Value) سے کم و بیش پر بیچنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد کی شکل میں نہ ہوں۔

۳- سود کے خلاف آواز اُٹھائے۔

۴- کمپنی کی آمدنی میں سود شامل ہو تو نفع کی اتنی مقدار صدقہ کردے۔

شیئرز سے تجارت (Capital Gain) کا حکم

شیئرز کی خرید و فروخت پر جو گفتگو اَب تک کی گئی ہے، یہ اس صورت میں ہے جبکہ شیئرز خریدنے والے کا مقصد کمپنی کا حصہ دار بن کر سرمایہ کاری کرنا ہی ہو، اگر خریدار کا مقصد سرمایہ کاری نہ ہو، بلکہ اس اِرادے سے خریدے کہ اس کی قیمت بڑھے گی تو فروخت کرکے نفع کماؤں گا۔ اس طریقے سے شیئرز کی خرید و فروخت کا کیا حکم ہے؟ اس میں بھی دو نقطۂ نظر ہیں۔ فقہ خصوصاً فقہ المعاملات میں مہارت رکھنے والے عالمِ اسلام کے معروف عالم شیخ محمد صدیق الضریر کی رائے یہ ہے کہ اس طریقِ کار کی

بنیاد محض تخمین اور قیاس آرائیوں پر ہے جس کو "Speculation" کہتے ہیں، اس لئے یہ جائز نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر خرید و فروخت کی اجازت دینا سٹہ بازی کا راستہ کھولنا ہے، ان کے ہاں شیئرز خریدنا صرف اس صورت میں جائز ہوگا، جبکہ خریدار کمپنی کے نفع، نقصان میں شریک ہوکر سرمایہ کاری کے لئے خرید رہا ہو۔

اُصولی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ اصل سوال یہ نہیں کہ خریدار کس ارادے اور نیت سے خرید رہا ہے، اصل سوال یہ ہے کہ شیئرز فی نفسہٖ بیع و شراء کے قابل ہیں یا نہیں؟ جب یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ شیئرز قابلِ بیع و شراء ہیں، شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصے کی بیع ہے تو خرید و فروخت جائز ہوگی خواہ کسی بھی نیت سے ہو، خواہ شیئرز اپنے پاس رکھ کر سرمایہ کاری کے لئے ہو یا قیمت بڑھنے پر بیچ کر نفع کمانے کے لئے ہو۔ کسی چیز کو قابلِ بیع و شراء ماننے کے بعد محض نیت کی بنیاد پر جواز و عدمِ جواز کی تفریق کی کوئی فقہی وجہ نہیں۔ ہاں! البتہ بیع و شراء کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور ان شرائط کی رعایت کرنے سے سٹہ بازی کا سدِ باب خود ہی ہو جائے گا۔

یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ تخمین و قیاس آرائی جس کو "Speculation" کہا جاتا ہے، بذاتِ خود حرام ہے، یہ بات غلط ہے۔ تخمین (Speculation) یہ ہے کہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ کس چیز کی قیمت بڑھ رہی ہے اور کس کی قیمت کم ہو رہی ہے، جس کی قیمت کم ہونے کا اندیشہ ہو اس کو بیچ دیا جائے اور جس کی قیمت بڑھنے کی اُمید ہو اس کو رکھا جائے۔ یہ بات بذاتِ خود ممنوع نہیں، یہ تو ہر تجارت میں ہوتی ہے۔ جو بات ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ بیع و شراء کی شرعی شرائط کی رعایت نہ کی گئی ہو، مثلاً غیر مملوک کی بیع یا غیر مقبوض کی بیع کی جارہی ہو، یا قمار کی شکل بن رہی ہو۔ قمار دو باتوں سے مل کر بنتا ہے، ایک یہ کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہو اور دُوسری طرف سے موہوم ہو۔ دُوسری بات یہ کہ جس طرف سے ادائیگی ہوگئی ہے اس کی رقم دو باتوں میں دائر ہو، یا تو یہ رقم خود بھی ڈوب جائے گی یا اور رقم کو کھینچ لائے گی۔

اس تفصیل کی روشنی میں شیئرز کی بیع و شراء کی جزئیات پر غور کیا جائے تو درج ذیل مسائل سامنے آتے ہیں:۔

۱- پہلے بتایا جاچکا ہے کہ بعض کمپنیوں کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اسٹاک ایکسچینج میں ان کی لسٹنگ ہوجاتی ہے، ایسی "Provisionally Listed" کمپنی کے شیئرز کی بیع وشراء جائز نہیں، اس لئے کہ شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں کی بیع ہوتی ہے، اور یہاں ابھی کمپنی کی ملکیت میں اثاثے ہیں ہی نہیں، لہٰذا یہ غیر مملوک کی بیع ہے جو جائز نہیں ہے، عملاً ایسے شیئرز کی بیع وشراء اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے، ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمپنی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کا دس روپے کا شیئر ۱۸۰ روپے تک میں فروخت ہوا۔

۲- "Future Sales" یعنی شیئرز کی ایسی بیع وشراء کہ شیئر لینا دینا مقصود نہ ہو، محض نفع، نقصان برابر کر کے نفع کمانا مقصود ہو، تو یہ بھی شرعاً جائز نہیں ہے۔

۳- غائب سودے جن میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے، وہ بھی شرعاً جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع کی وقتِ مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باتفاقِ فقہاء ناجائز ہے۔ البتہ مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جاسکتا ہے، لیکن وقت آنے پر بیع باقاعدہ کرنی ہوگی۔

۴- حاضر سودے جائز ہیں، خواہ نیت سرمایہ کاری کی ہو، چاہے شیئرز بیچ کر نفع کمانے کی ہو۔

۵- حاضر سودے میں بھی شیئرز کا قبضہ بعض انتظامی مجبوریوں کی بنا پر ایک سے تین ہفتوں تک تاخیر سے ہوتا ہے، حاضر سودا ہوجانے کے بعد شیئرز وصول کرنے سے پہلے ان کی آگے بیع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اس کا دار و مدار اس پر ہے کہ یہ معلوم ہو کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں؟ اگر بیع قبل القبض ہے تو جائز نہیں، ورنہ جائز ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے کہ یہ بیع قبل القبض ہے یا نہیں؟ پہلے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ شیئر کا قبضہ کس چیز کو کہیں گے؟ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے ''شیئر'' درحقیقت کمپنی کی اَملاک میں متناسب حصہ داری کا نام ہے، اور ''شیئر سرٹیفکیٹ'' درحقیقت اس حصہ داری کا تحریری ثبوت ہے، لہٰذا مبیع وہ تحریری ثبوت نہیں، بلکہ کمپنی کی اَملاک کا ایک مشاع حصہ ہے، یہ مشاع حصہ بیع کی تکمیل ہوتے ہی مشتری کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، چونکہ وہ حصہ مشاع ہے، اس لئے اس پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہٰذا اس میں

معنوی قبضہ ہی معتبر ہونا چاہئے۔ اب دو صورتیں ہیں، یا تو یوں کہا جائے کہ معنوی قبضہ اس وقت ہوگا جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، یا پھر یوں کہا جائے کہ جس وقت وہ مشاع حصہ مشتری کے ضمان میں آجائے اس وقت معنوی قبضہ متصوّر ہوگا۔ اس بات کو طے کرنے کے لئے بیع قبل القبض کی حقیقت معلوم کرنا ضروری ہے۔ بیع قبل القبض کی ممانعت کا دار و مدار دو وجوں پر ہے: ا- قبضے سے پہلے مبیع مقدور التسلیم نہیں ہوتا، لہٰذا یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ مشتری کو ضرور قبضہ کرادے گا، یہ غرر ہے جس کی بنا پر بیع جائز نہیں۔ بیع کی بہت سی صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان میں یہ غرر کی وجہ نہیں پائی جاتی، باوجود اس کے کہ مبیع حساً مقبوض نہیں لیکن حکماً وہ مشتری کے تصرف میں آجاتی ہے، لہٰذا ایسی صورتوں میں بیع قبل القبض نہیں پائی جائے گی۔ ۲- بیع قبل القبض کی ممانعت کی دُوسری وجہ یہ ہے کہ قبضے سے پہلے مبیع بائع کے ضمان میں نہیں آتا، اور ربح ما لم یضمن جائز نہیں۔

اب جہاں حسی قبضہ تو نہ ہوا ہو، مگر مشتری کا حکماً قبضہ ہو چکا ہو، یعنی مبیع ـــ انتفاع بھی مشتری کے تصرف میں آچکا ہو، اور اس کا ضمان بھی ثابت ہو چکا ہو، تو اس کی بیع جائز ہوگی۔ اسٹاک ایکسچینج کے لوگوں سے تفصیلی گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ حاضر سودا ہوجانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجاتی ہیں، وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہوجاتے ہیں، چنانچہ حاضر سودا ہوجانے کے بعد شیئرز پر حسی قبضے سے پہلے اگر کسی حادثے کے نتیجے میں کمپنی بالکل نیست و نابود ہوجائے تو نقصان مشتری کا سمجھا جاتا ہے، اسٹاک ایکسچینج بائع کو پیسے دِلوائے گا، ایسے ہی قبضے سے پہلے نفع (Dividend) تقسیم ہوجائے تو گو کمپنی تو بائع کے نام نفع جاری کرے گی، اس لئے کہ کمپنی کے ریکارڈ میں ابھی تک بائع کا نام ہی درج ہے، لیکن کاروباری ضابطے کی رُو سے وہ اس بات کا پابند ہوگا کہ شیئرز کے ساتھ نفع بھی مشتری کو دے۔ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ حسی قبضے سے پہلے بھی وہ شیئرز مشتری کے ضمان میں آچکے ہیں۔ اب جو بات باقی ہے وہ صرف یہ کہ شیئرز کی ملکیت کا تحریری ثبوت مشتری کے پاس آجائے، اور محض اتنی بات سے قبضہ منتفی نہیں ہوتا۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کے ہاتھ میں آنے سے پہلے بھی شیئر کی بیع جائز

ہو، لیکن دُوسری طرف اگر اس جانب نظر کی جائے کہ ہر چیز کے قبضے کا طریقہ عرف سے متعین ہوتا ہے، اور عرف میں شیئر کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، تو پھر عدمِ جواز کا حکم ہونا چاہئے، بالخصوص جبکہ اس طرح سٹے کے کاروبار کی حوصلہ افزائی بھی ہوسکتی ہے، لہٰذا ان متعارض جہات کی موجودگی میں احتیاط یہی ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے بیع نہ کی جائے۔

شیئرز پر زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز پر زکوٰۃ کے کیا اَحکام ہیں؟ اس سلسلے میں تین باتیں قابلِ ذکر ہیں:-

۱- کمپنی پر بحیثیت کمپنی (جو شخصِ قانونی ہے) زکوٰۃ واجب نہیں، اس کا مدار خلطة الشیوع کے مسئلے پر ہے، ائمہ ثلاثہ کے ہاں خلطة الشیوع کا اعتبار ہے اور زکوٰۃ مجموعہ پر واجب ہوتی ہے اور اِمام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں یہ بھی تصریح ہے کہ خلطة الشیوع کا اعتبار صرف سوائم ہی میں نہیں، اموالِ تجارت میں بھی ہوتا ہے، اس لئے ان کے ہاں کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اگرچہ کمپنی ایسا شخص نہیں جو مکلّف ہو اور زکوٰۃ ایک عبادت ہے جو مکلّف پر واجب ہوتی ہے، لیکن شافعیہ کا اُصول یہ ہے کہ زکوٰۃ انسان پر نہیں، بلکہ اموال پر واجب ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں نابالغ کے مال میں بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، حالانکہ وہ مکلّف نہیں، لہٰذا ان کے ہاں کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہے، مگر شیئر ہولڈرز پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس لئے کہ حدیث میں یہ اُصول مذکور ہے:-

"لا ثنی فی الإسلام"

یعنی ایک مال پر دُہری زکوٰۃ نہیں ہوتی ـــــ حنفیہ کے ہاں خلطة الشیوع کا اعتبار نہیں اور ان کے ہاں زکوٰۃ انسان پر واجب ہوتی ہے، اس لئے حنفیہ کے ہاں کمپنی پر بحیثیت شخصِ قانونی زکوٰۃ نہیں، شیئر ہولڈرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲- شیئرز پر زکوٰۃ کس حساب سے دی جائے گی؟ اس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں، ایک یہ کہ شیئرز کی قیمتیں تین طرح کی ہیں۔ ۱:- فیس ویلیو، یعنی سرٹیفکیٹ پر لکھی ہوئی قیمت۔ ۲:- مارکیٹ ویلیو، یعنی بازاری قیمت جس پر شیئرز بازار میں فروخت

ہوتے ہیں۔ ۳:- بریک اپ ویلیو (Break Up Value) یعنی اگر کمپنی تحلیل ہو تو شیئر کے مقابلے میں کمپنی کے اثاثوں کا جو حصہ آئے گا، وہ بریک اپ ویلیو ہے، ان تین طرح کی قیمتوں میں سے کس حساب سے زکوۃ واجب ہوگی؟ اگر کسی کمپنی کی بریک اپ ویلیو بہ آسانی معلوم ہوسکتی ہو تو غالباً زکوۃ کے حساب کی بنیاد بننے کے لئے وہ سب سے زیادہ موزوں ہے، لیکن بریک اپ ویلیو کا تعین بہت مشکل ہے، اور عام حصہ داروں کے لئے تو بہت ہی مشکل ہے، لہٰذا اس بات پر تقریباً تمام علمائے عصر کا اتفاق ہے کہ بازاری قیمت کا اعتبار ہوگا، اس لئے کہ قیمتِ اسمیہ اگرچہ ابتداءً سرمایہ لگاتے وقت تو حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے، مگر جب سرمایہ کمپنی کے اثاثوں میں بدل جائے گا تو اب فیس ویلیو حقیقت کے زیادہ قریب نہیں، اس لئے کہ اثاثوں کی قیمت کم وبیش ہوتی رہتی ہے، مارکیٹ ویلیو میں اثاثوں کے علاوہ دوسرے عوامل اثرانداز ہوں تب بھی مارکیٹ ویلیو حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔

دوسری بات یہ قابلِ غور ہے کہ شیئر کمپنی کے تمام اثاثوں میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، اور کمپنی کے بعض اثاثے قابلِ زکوۃ ہوتے ہیں، جیسے نقود، اموالِ تجارت وغیرہ، اور بعض قابلِ زکوۃ نہیں ہوتے، جیسے بلڈنگ، مشینری وغیرہ، شیئرز کی زکوۃ ادا کرتے ہوئے قابلِ زکوۃ یا ناقابلِ زکوۃ میں تفریق کی جائے گی یا نہیں؟ اس میں فقہائے عصر کی دو رائیں ہیں، مصر کے شیخ ابوزہرۃ مرحوم کی رائے یہ ہے کہ شیئرز خود عروضِ تجارت بن چکے ہیں، اس لئے ان کی پوری مارکیٹ ویلیو پر زکوۃ ہوگی۔ اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے پیچھے کتنے اثاثے قابلِ زکوۃ ہیں اور کتنے ناقابلِ زکوۃ ہیں؟ دوسرے علماء کی رائے یہ ہے کہ شیئرز چونکہ کمپنی کے اثاثوں میں ہی ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے اثاثوں کے قابلِ زکوۃ یا ناقابلِ زکوۃ ہونے کی تحقیق کی جاسکتی ہے۔ میں نے ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ اگر کسی نے کمپنی کے منافع میں شرکت کے لئے شیئر لیا ہے تو اس کو عروضِ تجارت میں شمار کرنا مشکل ہے، اس میں گنجائش ہے کہ اگر کسی کے لئے قابلِ زکوۃ اور ناقابلِ زکوۃ اثاثوں کی تحقیق ممکن ہو تو وہ تحقیق کرکے صرف قابلِ زکوۃ اثاثوں کی حد تک زکوۃ دے اور جو شخص یہ تحقیق نہ کرسکتا ہو وہ احتیاطاً پوری بازاری قیمت کی زکوۃ

دیدے۔ اور اگر کسی نے شیئر تجارت کرنے (Capital Gain) کے لئے اور آگے بیچ کر نفع کمانے کے لئے خریدا ہے تو یہ عروضِ تجارت میں شمار ہوگا، اس لئے کہ گویا اس نے کمپنی کے اثاثوں کا ایک متناسب حصہ آگے بیچنے کے لئے خرید لیا ہے اس لئے تمام قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۳-فقہی اُصول یہ ہے کہ کسی پر دیون واجب ہوں تو دیون منہا کرکے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، مگر یہ بات آج کل بہت قابلِ غور ہے کہ اکثر بڑے بڑے سرمایہ داروں نے بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں سے اتنے قرض لے رکھے ہوتے ہیں کہ ان کے قرضے ان کے قابلِ زکوٰۃ سرمائے سے عموماً بڑھ جاتے ہیں، عموماً صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ اگر ان کے قرضے منہا کئے جائیں تو نہ صرف یہ کہ ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ بعض صورتوں میں وہ خود مستحقِ زکوٰۃ قرار پائیں گے۔ اس سلسلے میں ایک تجویز تو یہ پیش کی جاتی ہے کہ مشینری پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے لیکن یہ بات اس لئے قابلِ تسلیم نہیں کہ مشینری کو مالِ زکوٰۃ قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ بات منصوص ہے، اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ زکوٰۃ سے دیون کا مستثنیٰ ہونا فقہاء کے ہاں متفق علیہ نہیں، حنفیہ اور حنبلیہ کے ہاں تو دیون مستثنیٰ ہوتے ہیں، شافعیہ کے ہاں مستثنیٰ نہیں ہوتے، اور مالکیہ کے ہاں نقود میں تو مستثنیٰ ہوتے ہیں، غیر نقود میں نہیں ہوتے۔[1] احقر کی ناچیز رائے اس مسئلے کے بارے میں یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو قرضہ لیا گیا ہے وہ کہاں صرف کیا گیا، اگر ان قرضوں کے ذریعے ایسی اشیاء خریدی گئیں جو خود قابلِ زکوٰۃ ہیں تو یہ قرضے زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اور اگر ان قرضوں سے ایسی اشیاء خریدی گئیں جو قابلِ زکوٰۃ نہیں تو یہ قرضے مستثنیٰ نہیں ہوں گے، ان قرضوں کے سلسلے میں مالکیہ اور شافعیہ کے قول پر عمل کیا جائے گا، یہ رائے قائم کرنے کے بعد حافظ ماردینی رحمہ اللہ کی کتاب "الجوهر النقی" میں نظر سے گزرا کہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول بھی اس کے قریب قریب ہے، وہ فرماتے ہیں: "ان كان عنده عروض تفی بدينه عليه زكوٰة العين."

(الجوهر النقی حاشية بيهقی ج:۴ ص:۱۴۹، باب الدّين مع الصدقة)

(۱) كتاب الفقه على المذاهب الأربعة للجزری ج:۱ ص:۶۰-۶۵، مبحث زكوٰة الدّين. وفقه الإسلام وأدلته ج:۲ ص:۷۴۷۔

نظامِ زر

(Monetary System)

زر، نقد (Money) کی تعریف

جو چیز عرفاً آلۂ مبادلہ کے طور پر استعمال ہوتی ہو اور وہ قدر کا پیمانہ ہو اور اس کے ذریعے مالیت کو محفوظ کیا جاتا ہو، اسے ''زر'' کہتے ہیں۔ یہ تین خصوصیات جس چیز میں پائی جاتی ہوں اس کو معاشی اصطلاح میں عربی میں ''نقد'' اور اُردو میں ''زر'' اور انگریزی میں "Money" کہتے ہیں۔ مالیت کے تحفظ سے مراد یہ ہے کہ کسی کے پاس جنس رکھی ہوئی ہو تو اس کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے، نیز ضروری نہیں کہ ہر وقت اس کا کوئی خریدار مل جائے، اس لئے اس کی مالیت مکمل طور پر محفوظ نہیں۔ اس کے بجائے اگر زر رکھ لیا جائے تو عام حالات میں اس سے مالیت محفوظ رہتی ہے، یعنی غیر معمولی حالات سے قطع نظر، اس کی ذاتی قیمت یکساں رہتی ہے، نیز اس سے کوئی بھی چیز جب چاہیں خریدی جاسکتی ہے۔

زر اور کرنسی میں فرق

زر وہ چیز ہے جس کے ذریعے سے تبادلہ ہوتا ہو، قدر کی پیمائش ہوتی ہو اور مالیت کا تحفظ بھی ہو، مگر یہ ضروری نہیں کہ قانونی طور پر بھی اس کو جبری آلۂ تبادلہ قرار دیا گیا ہو۔ مثلاً چیک یا انعامی بانڈز جیسی دستاویزات سے لوگ تبادلہ کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص انعامی بانڈ سے ادائیگی کرے اور دوسرا شخص اپنا حق انعامی بانڈ کی صورت میں لینے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو قانوناً لینے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اور کرنسی وہ زر ہے جس کو خاص ملک میں قانونی طور پر آلۂ تبادلہ قرار دیا گیا ہو جیسے روپیہ۔ اگر کوئی

شخص روپے میں ادائیگی کرے تو قانوناً اسے لینے پر مجبور کیا جائے گا۔ ایسی قانونی کرنسی کو عربی میں "عملة قانونية"، اُردو میں ''زرِقانونی'' اور انگریزی میں "Legal Tender" کہتے ہیں۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں، ایک ایسی کرنسی جس میں ایک خاص حد تک قانوناً ادائیگی کی جاسکتی ہے، اس سے زائد مقدار دی جائے گی تو قانوناً اسے لینے پر جبر نہیں کیا جائے گا۔ جیسے چونی کہ اگر کوئی شخص چونیوں سے کوئی بڑا قرض ادا کرنا چاہے تو لینے والا قانوناً اسے لینے سے انکار کرسکتا ہے، اور یہ مطالبہ کرسکتا ہے کہ میرا قرض مجھے روپیہ میں ادا کرو، اس کو عربی میں **"عملة قانونية محدودة"**، اُردو میں ''محدود زرِ قانونی'' اور انگریزی میں "Limited Legal Tender" کہتے ہیں۔ دُوسری قسم جس میں قانوناً ادائیگی کی کوئی حد مقرّر نہ ہو، اس کو **"عملة قانونية غير محدودة"** یا ''غیر محدود زرِقانونی'' یا "Unlimited Legal Tender" کہتے ہیں، جیسے دھات یا کاغذ کا روپیہ۔

زَر کا اِرتقاء اور مختلف نظامہائے زَر

اِبتداءً لوگوں میں سامان کے بدلے سامان کی بیع کا طریقہ رائج تھا، جس کو "مقابضة" (Barter) کہتے ہیں۔[1] مگر اس میں متعدد دُشواریاں تھیں مثلاً یہ کہ سامان کا نقل و حمل مشکل تھا، اس طریقے میں طلب و رسد کا ایک ہی جگہ ملاپ کم ہوتا تھا۔ مثلاً ایک شخص گندم دے کر کپڑے کا خواہش مند ہے اور کپڑے والا گندم لینا نہیں چاہتا، اَجناس کو چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کرکے ان کو کاروبار کی بنیاد بنانا مشکل تھا۔ "مقابضة" (Barter) کے بعد بعض اہم اشیاء کو ہی ثمن قرار دے دیا گیا، مثلاً گندم، جو، چمڑا وغیرہ۔ اس کے بعد سونے اور چاندی کو ثمن قرار دیا گیا، اس لئے کہ یہ عالمی طور پر قابلِ قبول تھے اور ان کا نقل و حمل بھی آسان تھا۔ اِبتداءً سونے کے ذریعے مبادلات سکہ ڈھالے بغیر ان کے وزن کی بنیاد پر ہوتے تھے، اس کے بعد سکے ڈھالنے کا آغاز

(۱) کتابوں میں یہی لکھا گیا ہے، لیکن تاریخ اس بات کی توثیق نہیں کرتی، اس لئے کہ تاریخی طور پر ایسا کوئی دور نہیں ملتا جس میں کوئی چیز بطور زر اور ثمن کے رائج نہ ہو۔

ہوا۔ شروع میں ہر شخص کو سکے ڈھالنے کی اجازت ہوتی تھی، اس دور کے نظام کو ''طلائی معیار'' اور عربی میں "قاعدة الذهب" اور انگریزی میں "Gold Standard" کہتے ہیں۔ پھر سونے کے علاوہ چاندی کے سکے بھی ڈھالے جانے شروع ہوئے، اس نظام زر کو جس میں سونے اور چاندی دونوں کے سکے ڈھالے جاتے تھے۔ ''دو دھاتی معیار'' (Bi-Metallic Standard) کہتے ہیں، اور عربی میں "نظام المعدنین" کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ایسا دور آیا کہ لوگ سونے، چاندی کے سکے صرّافوں کے پاس امانت رکھوا دیتے تھے اور صرّاف اس کے وثیقے کے طور پر رسید لکھ دیتے تھے، بوقتِ ضرورت رسید دِکھا کر صرّاف سے اپنا سونا واپس لیا جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ لوگوں نے صرّافوں کی دی ہوئی رسیدوں سے اشیاء خریدنی شروع کردیں، یعنی بجائے اس کے کہ خریدار پہلے صرّاف سے سونا لے کر بائع کو دے، اور بائع سونا لے کر پھر صرّاف کے پاس رکھوائے، خریدار بائع کو سونے کی رسید دے دیتا، جس کا مطلب یہ ہوتا کہ اس رسید کا سونا بائع کی طرف منتقل ہوگیا ہے، اس طرح رسیدوں سے لین دین شروع ہوگیا، اور صرّافوں سے سونا واپس لینے کی نوبت کم آنے لگی۔ جب صرّافوں نے دیکھا کہ لوگ عموماً سونا واپس لینے نہیں آتے تو انہوں نے لوگوں کا رکھا ہوا سونا دُوسروں کو قرض دینا شروع کردیا، اس طرح نوٹ اور بینکنگ کا آغاز ہوا، یعنی صرّافوں کی جاری کی ہوئی رسیدیں نوٹ بن گئیں جس کی تفصیل بینکنگ پر گفتگو کرتے ہوئے ذکر کی جائے گی۔ اِبتداءً ہر شخص نوٹ جاری کرسکتا تھا، مگر اس وقت یہ زَرِ قانونی (Legal Tender) نہیں تھے، صرف لوگوں کے تعامل کی وجہ سے قابلِ قبول تھے۔ اس مقبولیت اور سہولت کے پیشِ نظر بعد میں نوٹ کو زَرِ قانونی (Legal Tender) قرار دیا گیا۔ لیکن زَرِ قانونی کی حیثیت رکھنے والے نوٹ ہر شخص کو جاری کرنے کی اجازت نہیں تھی، حکومت کے منظور شدہ (Authorised) اِدارے (بینک) ہی جاری کرسکتے تھے، شروع میں عام تجارتی بینک بھی نوٹ جاری کرتے تھے، بعد میں یہ اختیار صرف مرکزی بینک کی حد تک محدود کردیا گیا۔

نوٹ کے "Legal Tender" بننے کے بعد اس پر کئی دور گزرے ہیں، ایک دور وہ تھا جب نوٹ کے پیچھے سو فیصد سونا ہوتا تھا، قانونا اس بات کی پابندی تھی کہ جتنا سونا موجود ہے، اتنے ہی نوٹ جاری کئے جائیں۔ اس نظام کو عربی میں "قاعدة سبائک الذهب" اور انگریزی میں "Gold Bullion Standard" کہتے ہیں۔ پھر جب دیکھا گیا کہ لوگ سونا لینے کم ہی آتے ہیں تو نوٹ کی پشت پر سونے کی شرح کم کردی گئی، شرح کے تناسب بدلتے رہے یعنی نوٹ کی پشت پر رکھے ہوئے سونے کی فیصد شرح گھٹتی چلی گئی، ایسے نوٹ کو جس کی پشت پر سو فیصد سونا نہ ہو "نـقـود الثقة" (Fiduciary Money) کہتے ہیں۔ پھر سونے کی شرح کم ہوتے ہوتے صفر رہ گئی. اور کم از کم ملکی معاملات کی حد تک نوٹ کی پشت پر سونے کا وجود ضروری نہیں رہا. ایسے نوٹوں کو "النقود الرمزية" (Token Money) کہتے ہیں۔ ان سکوں کی قانونی قیمت حقیقی قیمت کی نمائندگی نہیں کرتی، مثلاً سو روپے کے نوٹ کی قانونی قیمت سو روپے ہے، مگر اس کی ذاتی قیمت کچھ بھی نہیں۔ کچھ عرصے تک ''نقود رمزیہ'' کا بھرم اس طرح رہا کہ بیشتر ممالک نے اپنے نوٹوں کو ڈالر سے وابستہ کر رکھا تھا، گویا ان کے نوٹوں کے پیچھے ڈالر تھے، اور چونکہ امریکا نے ڈالر کے بدلے سونا دینے کا اقرار کیا ہوا تھا، اس لئے ڈالر کے پیچھے سونا تھا، اور اس طرح دوسرے ملکوں کے نوٹ بھی بالواسطہ سونے سے وابستہ تھے۔ لیکن بالآخر ۱۹۷۱ء میں امریکا نے بھی سونے سے ڈالر کی وابستگی ختم کر دی، جس کی تفصیل آرہی ہے، اور اس طرح اب کسی نوٹ کے پیچھے کوئی سونا چاندی نہیں ہے، اب ''نوٹ'' محض ایک اِصطلاحی ثمن ہے جو قوتِ خرید کی نمائندگی کرتا ہے اور بس۔

شرحِ مبادلہ کا تعین

مختلف ملکوں کی کرنسیوں کے باہمی تبادلے کی شرح کیسے متعین ہوتی ہے؟ اس کے بھی مختلف زمانوں میں مختلف طریقے رائج رہے ہیں۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۱۳ء تک دُنیا میں طلائی نظام رائج تھا، گو اس سے پہلے بھی طلائی نظام رائج تھا، مگر جس طرح اس دور میں مکمل طور پر رائج رہا ویسے پہلے رائج نہ تھا۔

طلائی نظام میں ہر ملک کی کرنسی سونے کی ایک مخصوص مقدار کی نمائندگی کرتی تھی، مثلاً انگلینڈ نے طے کر رکھا تھا کہ ایک پونڈ کے پیچھے سونے کی اتنی مقدار ہوگی اور امریکا نے بھی طے کر رکھا تھا کہ امریکی ڈالر کے پیچھے سونے کی اتنی مقدار ہوگی۔ جب یہ طلائی نظام رائج تھا اس وقت دوملکوں کی کرنسیوں میں تبادلے کی شرح ان کرنسیوں کی پشت پر موجود سونے کی مقدار کے تناسب سے طے ہوتی تھی۔ یعنی یہ دیکھا جاتا تھا کہ ہر ملک کی کرنسی کے پیچھے سونے کی کتنی مقدار ہے۔ دوملکوں کی کرنسیوں کے بدلے میں ملنے والی سونے کی مقداروں میں جو تناسب ہوتا اسی تناسب سے کرنسیوں کا تبادلہ ہوتا تھا۔ مثلاً اگر انگلینڈ کے پونڈ کے پیچھے چار تولے سونا ہو اور امریکی ڈالر کے پیچھے دوتولے سونا ہوتو پونڈ اور ڈالر میں ایک اور دو کی نسبت ہوئی، لہٰذا ایک پونڈ کا دو ڈالر سے تبادلہ ہوگا۔

اس کے بعد رفتہ رفتہ طلائی نظام ختم ہوگیا، اس کے بعد شرح مبادلہ کے تعین کا کیا طریقہ رائج ہوا؟ اس کو سمجھنے کے لئے بین الاقوامی تجارتی نظام میں جو تبدیلیاں آئیں ان کی اِجمالی وضاحت ضروری ہے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد دُنیا کا اِقتصادی نظام درہم برہم ہوا، پھر ۱۹۳۰ء میں عالمی کساد بازاری ہوئی اور تمام ممالک نے نوٹ پر سونا دینا بند کردیا۔ پھر دُوسری جنگ کے بعد انگلینڈ اور یورپ کے دُوسرے ممالک اِقتصادی طور پر درہم برہم ہوگئے، مگر امریکا اِقتصادی طور پر خاصا مستحکم تھا، اس کے پاس سونے کے کافی ذخائر تھے۔ ۱۹۴۴ء میں امریکا کے تعاون سے یورپ کی تعمیرِ نو کے لئے متعدد ممالک کی ایک عظیم کانفرنس منعقد ہوئی، یہ کانفرنس امریکا کے ایک شہر ''بریٹن ووڈز'' (Bretton Woods) میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس کا موضوع یہ تھا کہ عالمی تجارت کو کیسے فروغ دیا جائے؟ سرمایہ کاری (Investment) کو کیسے فروغ دیا جائے؟ اور نیا عالمی نظامِ زر کس طرح طے کیا جائے جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو ''طلائی نظام'' میں تھیں۔ اس کانفرنس نے تین اِدارے قائم کرنے کی تجویز منظور کی اور ایک نظام طے کیا گیا۔ پہلے ان تین اِداروں کا مختصر تعارف کرایا جاتا ہے، پھر نظام پر گفتگو ہوگی۔

بریٹن ووڈز کانفرنس کے تین اِدارے

۱- پہلا اِدارہ جس کا قیام اس کانفرنس میں طے پایا تھا وہ ہے "بین الاقوامی تجارتی تنظیم" (International Trade Organization) جس کو عربی میں "منظمة التجارة الدولية" کہتے ہیں۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سولہویں صدی سے اٹھارہویں صدی تک یہ نظریہ بہت مقبول تھا کہ ہر ملک اِقتصادی ترقی کے لئے اپنا سونا بڑھائے اور اس کے لئے برآمدات کو فروغ دے اور درآمدات میں رُکاوٹیں ڈالے۔ اس نظریے کو مرکنٹائل ازم (Mercantilism) اور عربی میں "مذهب التجاريين" کہتے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ نظریہ کامیاب نہ ہوا اور یہ نظریہ مقبول ہوا کہ اِقتصادی ترقی کے لئے بین الاقوامی تجارت کو فروغ دیا جائے اور درآمدات پر ایسی پابندیاں نہ لگائی جائیں جو بین الاقوامی تجارت میں رُکاوٹ ڈالیں۔ اسی نظریے کے پیش نظر اس کانفرنس میں مذکورہ اِدارے کا قیام طے ہوا، جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ اِدارہ بین الاقوامی تجارت میں حائل رکاوٹوں کو ختم کرنے کا انتظام کرے گا، مگر امریکا اس اِدارے کے قیام کا مخالف تھا، اس لئے کہ امریکا ایک زرعی ملک ہے، اگر بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہوتا تو یورپ کا مال سستے دام پر امریکا میں آتا اور کسان زراعت کو چھوڑ کر تجارت کی طرف متوجہ ہوتے، اس سے امریکا کی زرعی پالیسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ ایک عرصے تک اس اِدارے کا قیام امریکا اور دُوسرے ممالک میں باعث نزاع بنا رہا، دُوسرے ممالک اس اِدارے کے قیام کا مطالبہ کرتے تھے اور امریکا انکار کرتا تھا۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۸ء میں باہمی مصالحت ہوئی اور اس کے نتیجے میں ایک اور اِدارہ وجود میں آیا جس کو "جنرل ایگری مینٹ آن ٹیرف اینڈ ٹریڈ" (General Agreement on Tariff and Trade) کہتے ہیں۔ جس کے معنی اُردو میں یوں کئے جاسکتے ہیں "محصولات و تجارت کا معاہدۂ عام"، اس اِدارے کو تخفیفاً "گیٹ" (GAAT) کہتے ہیں، عربی میں اس اِدارے کو "الإتفاقية العامة للتصرفات الجمركية والتجارة" کہتے ہیں۔

اس معاہدے سے زرعی اَجناس کو مستثنیٰ کرلیا گیا تھا، زرعی اَجناس کے علاوہ دیگر مصنوعات میں بین الاقوامی تجارت کو فروغ دینے کے لئے یہ اُصول طے ہوئے:-

ا:...... کوئی ملک بین الاقوامی تجارت میں کوئی پابندی یا رُکاوٹ عائد کرے تو دُوسرے ممالک اس رُکاوٹ کو ختم کرانے کے لئے ''گیٹ'' میں آواز اُٹھاسکیں گے، اور جو ملک اس ''گیٹ'' کے ممبر ہیں ان پر ''گیٹ'' کے فیصلے پر عمل درآمد کرنا ضروری ہوگا، تجارت میں رُکاوٹیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ا:-محصولاتی رُکاوٹیں، کوئی ملک کسی ملک کی مصنوعات پر زیادہ محصول لگاتا ہے، جس کی وجہ سے اس ملک کی مصنوعات اس ملک میں مہنگی ہوجاتی ہیں، اور ان کی خرید وفروخت کم ہوتی ہے۔ ۲:-غیرمحصولاتی رُکاوٹیں، محصول کے علاوہ کوئی اور پابندی ایسی لگادی جائے جس کی وجہ سے دُوسرے ممالک کی مصنوعات منگوانے میں لوگ تنگی محسوس کریں، مثلاً فرانس نے جاپان کی وی.سی.آر پر یہ پابندی لگادی تھی کہ یہ صرف فلاں چھوٹے پورٹ سے ہی آسکے گا۔

۲:...... دُوسرا اُصول یہ طے ہوا کہ کوئی ملک کسی ملک کے ساتھ اِمتیازی سلوک نہیں کرے گا، اگر کوئی ملک ایک ملک کے ساتھ بہتر طریقے سے تجارت کرے اور دُوسرے ملک کے ساتھ اور طریقے سے تجارت کرے تو یہ ملک گیٹ میں آواز اُٹھاسکے گا۔

۳:...... کسی ملک پر اِمتیازی محصول نہیں لگایا جائے گا، اگر کسی ملک پر اِمتیازی محصول لگایا گیا تو وہ ''گیٹ'' میں آواز اُٹھاسکتا ہے۔

۴:...... غریب ممالک کو بیرونی مصنوعات پر محصول زیادہ لگانے کی اجازت ہوگی، اس لئے کہ غریب ممالک بھی اگر محصول کم رکھیں گے تو بیرونی مصنوعات سستی ملیں گی، جس کی وجہ سے ملکی مصنوعات کی مانگ کم پڑے گی اور ملکی صنعت کو نقصان پہنچے گا۔

۵:...... اگر دو ممالک میں تجارتی نزاع پیدا ہوگا تو ''گیٹ'' کے ذریعے باہمی اِفہام وتفہیم سے حل کیا جائے گا۔

عالمی مالیاتی فنڈ

۲- دُوسرا اِدارہ جو وضع ہوا، وہ ''عالمی مالیاتی فنڈ'' تھا جس کو عربی میں ''صندوق النقد الدولی'' اور انگریزی میں "International Monetary Fund" کہتے ہیں، آسانی کے لئے آئی ایم ایف (I.M.F) سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۴ء میں اس کا قیام طے ہوا اور یہ ۱۹۴۸ء میں وجود میں آیا۔

جس طرح ایک مُلک کے کئی بینکوں کا ایک مرکزی بینک ''سنٹرل بینک'' ہوتا ہے، ایسے ہی کئی ممالک کے سنٹرل بینکوں کا مرکزی بنک یہ اِدارہ ہے، گویا یہ پوری دُنیا کا ایک مرکزی بینک ہے، جو وقتی ادائیگیوں کے لئے ملکوں کو قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے، کبھی کسی ملک کی مالی حالت تو مستحکم ہوتی ہے، مگر وقتی طور پر کسی تجارت کی ادائیگی کے لئے نقد پیسے اس کے پاس نہیں ہوتے، ایسے موقع پر یہ ادارہ قرضہ فراہم کرتا ہے۔

اس اِدارے میں ہر ملک کا ایک ''کوٹا'' (Quota) ہوتا ہے، یہ کوٹا اس ملک کی تجارت کا عالمی تجارت کے ساتھ تناسب دیکھ کر مقرّر کیا جاتا ہے۔ مثلاً عالمی تجارت ایک ارب ڈالر کی ہوئی اور کسی ملک کی تجارت پانچ کروڑ ڈالر کی ہے، تو اس ملک کو پانچ فیصد کوٹا ملے گا۔ اس کوٹے کی شرح میں کمی بیشی بھی ہوتی رہتی ہے، پھر اس کوٹے کی رقم ڈالر میں بیان کی جاتی ہے، یعنی جس ملک کا کوٹا پانچ فیصد ہے، اس کے بارے میں یہ متعین ہوتا ہے کہ اس کا مطلب اتنے ڈالر ہیں۔ ہر ملک اپنے کوٹے کا ۲۵ فیصد سونے میں اور ۷۵ فیصد اپنے ملک کی کرنسی میں اِدارے کے پاس جمع کراتا ہے، اس طرح آئی ایم ایف کے پاس کچھ سونا اور تمام ممالک کی کرنسیاں جمع ہوجاتی ہیں۔ ہر ملک کو آئی ایم ایف میں فنڈ جمع کرانے پر اِدارے سے قرض لینے کا حق ملتا ہے، جس کو "Drawing Rights" اور عربی میں "حقوق السحب" کہا جاتا ہے۔ جمع کرائی ہوئی رقم کی متناسب شرح پر قرض کا حق ملتا ہے، مثلاً یہ کہ ہر ملک اپنی جمع کرائی ہوئی رقم کا پانچ گنا قرض لے سکے گا۔ اور یہ شرح بدلتی بھی رہتی ہے، پھر "Drawing Rights" پر جو قرضہ ملتا ہے، اس کو کئی حصوں پر تقسیم کرلیا جاتا ہے، ہر حصے کو ٹرانچ

(Tranche)[1] کہتے ہیں۔ پہلی ٹرانچ اس قرضے کا ۲۵ فیصد ہوتا ہے جس کے لینے کا کسی ملک کو حق ہوتا ہے، اس ٹرانچ پر قرضہ بغیر کسی شرط کے ملتا ہے اور سود بھی کم ہوتا ہے۔ اس ٹرانچ کو "Gold Tranche" کہتے ہیں۔ اس کے بعد والی ٹرانچوں میں قرض لینے میں مشکلات درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی ہیں۔ آئی ایم ایف قرض دینے کے لئے بہت سی شرائط عائد کرتا ہے، ان ٹرانچوں میں سود بھی بڑھتا جاتا ہے اور قرضے قلیل المیعاد ملتے ہیں، ان ٹرانچوں کو "Conditionality Tranches" کہتے ہیں۔

اس اِدارے کی پالیسیاں ممبر ممالک کی ووٹنگ سے طے ہوتی ہیں، اور ووٹنگ کا حق ممالک کی تعداد پر نہیں، بلکہ کوٹے کی بنیاد پر ملتا ہے، جس کا کوٹا زیادہ اس کو ووٹنگ کا حق بھی زیادہ ملتا ہے اور جس کا کوٹا کم ہے اس کو ووٹنگ کا حق بھی کم ہوتا ہے۔ آئی ایم ایف میں ایک اور اکاؤنٹ ہوتا ہے جس کو "Special Drawing Rights"، (S.D.R)۔ اور عربی میں ''حقوق السحب الخاصۃ'' کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ ممبران طے کر لیتے ہیں کہ اس سال مجوزہ قرضوں کے علاوہ مزید اتنے قرضے اور دیئے جا سکتے ہیں، مزید قرضوں کو ممالک پر تقسیم کا تناسب بھی کوٹے کی شرح کے مطابق ہوتا ہے۔

عالمی بینک

۳۔ تیسرا اِدارہ جس کا قیام ''بریٹن ووڈز کانفرنس'' میں طے ہوا، اس کا نام "International Bank For Reconstruction and Development" تھا۔ جس کو (I.B.R.D) بھی کہتے ہیں۔ جس کو عربی میں "البنک الدولی للانشاء والتعمیر" کہتے ہیں۔ آسانی کے لئے اس کا مختصر نام "World Bank" (ورلڈ بینک) ہے، اب یہی نام زیادہ معروف ہے، پہلا نام معروف نہیں، مگر اصل نام وہی طے ہوا تھا۔

اس ادارے میں اور آئی ایم ایف میں فرق یہ ہے کہ آئی ایم ایف قلیل المیعاد قرضے دیتا ہے، جس کی مدت تین سے پانچ سال تک ہوتی ہے، اور ورلڈ بینک

(۱) فرانسیسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی قاش اور ٹکڑے کے ہیں۔

طویل المیعاد قرضے دیتا ہے جس کی مدت پندرہ سے تیس سال تک ہوتی ہے، ابتداء اس ادارے نے مشروعات (پراجیکٹس) کے لئے قرضے دیئے، جیسے شاہراہیں بنانا وغیرہ۔ پھر ۱۹۶۰ء کے بعد عمومی قرضے دینے بھی شروع کردیئے، اب یہ ادارہ پالیسی ساز قرضے بھی دیتا ہے، یعنی یوں کہتا ہے کہ اگر تم ملک کی پالیسی اس طرح بناؤ تو اتنا قرضہ ملے گا۔

بریٹن ووڈز کا نظام شرحِ مبادلہ

بریٹن ووڈز کانفرنس میں جو تین ادارے طے پائے تھے، ان کا تعارف تو ہوچکا ہے، اسی کانفرنس میں کرنسیوں کے مبادلے کا جو نظام طے ہوا اس کی وضاحت یہ ہے۔

۱۹۳۱ء میں طلائی نظام تو ختم ہوچکا تھا، اس کانفرنس میں شرحِ مبادلہ کا ایک اور نیا نظام طے پایا جو "Brettonwoods System of Exchange Rate" کے نام سے معروف ہے۔ اس نظام کا حاصل یہ ہے کہ اب بھی کرنسی کی قدر کا پیمانہ تو بنیادی طور پر سونا ہی رہا، مگر ہر ملک کی کرنسی پر سونا نہیں ملتا تھا، بلکہ اب بین الاقوامی تجارت میں آلۂ تبادلہ ڈالر کو قرار دیا گیا۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ امریکا کے ڈالر کو سونے سے وابستہ کردیا گیا، اس لئے کہ امریکا کی حالت مستحکم تھی، وہ ڈالر پر سونا دینے کو تیار تھا، چنانچہ ابتداءً ایک اونس سونے کے مقابلے میں ۳۵ ڈالر ہوتے تھے، اس کے بعد امریکا نے ڈالر کی قیمت بڑھادی اور ۴۲ ڈالر پر ایک اونس سونا ملنے لگا، صرف ہر ملک کا مرکزی بینک امریکا کو ڈالر دے کر اس سے سونا لے سکتا تھا اور امریکا دینے کو تیار تھا، مگر عملی طور پر عموماً سونا کوئی ملک بھی نہیں لیتا تھا، ڈالر سے ہی کاروبار چلتا تھا، اس طرح ڈالر سونے سے وابستہ تھا، اور باقی تمام ممالک کی کرنسیوں کو ڈالر سے وابستہ کردیا گیا تھا، اور آئی ایم ایف میں معاہدہ اس طرح طے پایا کہ "ہر ملک اپنی کرنسی کی شرح بیک وقت ڈالر اور سونے دونوں سے بتائے گا" مثلاً اتنے روپے میں ڈالر ...

اور ان روپوں کے عوض اتنا سونا ہوگا، مگر عملاً کرنسی کی شرح صرف ڈالر سے بتائی گئی، اس طرح تمام کرنسیاں ڈالر سے اور ڈالر سونے سے وابستہ ہوا۔

آئی.ایم.ایف میں یہ معاہدہ بھی طے ہوا کہ کسی ملک کی کرنسی کی جو قیمت ڈالر سے طے ہوئی ہے، اگر ملک کی کرنسی کی قیمت میں اُتار چڑھاؤ ہوا تو وہ اُتار چڑھاؤ اگر دو فیصد تک ہے تو گوارا ہے، یعنی کرنسی کی قیمت طے شدہ ریٹ سے دو فیصد کم یا دو فیصد زیادہ ہوگئی تو یہ گوارا ہے، لیکن اگر کرنسی کی قیمت دو فیصد سے زیادہ بڑھ گئی یا گرگئی تو مرکزی بینک قیمتوں پر اثرانداز ہوکر کرنسی کو طے شدہ قیمت پر لائے گا۔ مرکزی بینک کے اثرانداز ہونے کا طریقہ یہ ہوگا کہ اگر کرنسی کی قیمت بازار میں طے شدہ ریٹ سے کم ہوگئی ہے تو مرکزی بینک زیادہ قیمت پر لوگوں سے کرنسی خریدنے لگ جائے گا تو بڑی حد تک اُمید ہے کہ قیمت بڑھ جائے گی، اور اگر کرنسی کی قیمت بازار میں طے شدہ ریٹ سے زیادہ ہوگئی تو مرکزی بینک کم قیمت پر فروخت کرنے لگے گا، جس کے نتیجے میں قیمت کم ہوجانے کا قوی اِمکان ہے۔ اگر اس طریقے سے بھی ریٹ کنٹرول نہ ہو تو آئی.ایم.ایف سے رُجوع کیا جائے گا، آئی.ایم.ایف یا تو ریٹ کنٹرول کرنے کے لئے مزید ڈالر دے گا یا اس ملک کی کرنسی کا ریٹ بدل دے گا۔

اس پوری تفصیل سے یہ بات سامنے آگئی کہ بریٹن ووڈز کے اس نظام میں شرحِ مبادلہ (Exchange Rate) طے شدہ (Fixed) ہے، اس لئے اس نظام کو انگریزی میں "Fixed Exchange Rate System" اور عربی میں "نظام سعر الصرف الثابت" کہتے ہیں۔ اس سے پہلے شرحِ مبادلہ کا جو طلائی نظام جاری تھا اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ اس میں کرنسی کے پیچھے سونے کی مقدار طے شدہ ہوتی تھی اور ریٹ ایک ہی (Fixed) رہتا تھا، جس کی وجہ سے ہر تاجر کرنسی کے ریٹ میں اُتار چڑھاؤ کے اندیشے کے بغیر پُر اِعتماد ہوکر تجارت کرتا تھا۔ بریٹن ووڈز کے اس نظام میں بھی طلائی نظام کی اس خوبی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ طلائی نظام میں ایک سقم تھا، اس سے اِجتناب کا راستہ نکالا گیا

ہے۔ وہ سقم یہ تھا کہ طلائی نظام میں شرحِ مبادلہ کی تبدیلی میں حکومت کا عمل دخل نہیں تھا، بریٹن ووڈز کے مذکورہ نظام میں شرحِ مبادلہ میں تبدیلی کی گنجائش بھی رکھی گئی ہے۔

بریٹن ووڈز کے نظام کا زوال

مذکورہ بالا نظام کا مدار اس بات پر تھا کہ کوئی ایک متمول ملک اپنی کرنسی پر سونا دینے کے لئے تیار ہو، چنانچہ اس وقت امریکا اس کے لئے تیار تھا کہ ڈالر کے بدلے سونا دے گا، مگر عملاً امریکا سے سونے کا مطالبہ کوئی بھی نہیں کرتا تھا، البتہ فرانس نے امریکا سے ڈالر پر سونے کا مطالبہ شروع کیا جس سے فرانس اور امریکا کے حالات بھی سازگار نہیں رہے، اور امریکا کے پاس سونے کا ذخیرہ کم ہونے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۱ء میں امریکا نے سونا دینے سے انکار کردیا اور بریٹن ووڈز کا نظام ختم ہوگیا، طے شدہ شرحِ مبادلہ کا نظام (Fixed Exchange Rate System) قائم نہ رہا۔ اب شرحِ مبادلہ کے نظام کے لئے دو نظریے سامنے آئے، ۱-ایک نظریہ یہ کہ جیسے باقی اَجناس کا کوئی ریٹ طے نہیں ہوتا، بلکہ آزاد بازار خود ہی طلب و رسد کی بنیاد پر ریٹ طے کرتا ہے، ایسے ہی کرنسی کے ریٹ کو بھی کھلے بازار پر چھوڑ دیا جائے، طلب و رسد کی بنیاد پر خود ہی ریٹ طے ہوتا رہے گا، مثلاً ڈالر اور پاکستانی روپے کی طلب و رسد سے پاکستانی روپے کا ڈالر کے ساتھ ریٹ طے ہوگا۔ بین الاقوامی تجارتی منڈی میں طلب و رسد سے باقی کرنسیوں کے ساتھ پاکستانی روپے کا ریٹ طے ہوگا۔ اس نظریے کو "Freely Floating Exchange Rates" کا نظریہ کہتے ہیں، اور عربی میں "أسعار الصرف العائمة الحرة" کہتے ہیں۔ ۲-دُوسرا نظریہ یہ تھا کہ اُصولی طور پر تو ریٹ آزاد ہی رہنا چاہئے تاہم اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو چاہئے کہ وہ ریٹ پر نگاہ رکھے، اگر کبھی ریٹ میں بہت زیادہ اِفراط یا تفریط ہونے لگے تو حکومت مداخلت کرے۔ جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ اسٹیٹ بینک کو کہے کہ وہ بازار میں آکر قیمتوں پر اثرانداز ہو، اس نظریے کو انگریزی میں "Managed Float" کا نظریہ کہتے ہیں، عربی میں "أسعار الصرف العائمة المدراة" کہہ سکتے ہیں۔

کاغذی نوٹ کی حیثیت اور اس کے فقہی اَحکام

مذکورہ تفصیلات سے یہ بات سامنے آئی کہ کاغذی نوٹ پر کئی اَدوار گزرے ہیں، پہلے اس کے پیچھے مکمل طور پر سونا ہوتا تھا، جس کو "Gold Bullion Standard" کہتے ہیں، پھر "Fiduciary Money" کا دور آیا جبکہ ان کے پیچھے مکمل طور پر تو سونا نہیں ہوتا تھا، لیکن مخصوص تناسب سے سونا ہوتا تھا، پھر ایک وقت آیا کہ تمام کرنسیاں ڈالر سے وابستہ تھیں اور ڈالر سونے سے وابستہ تھا، پھر ۱۹۷۱ء کے بعد امریکا نے بھی سونا دینے سے انکار کردیا تو اب اس نوٹ کے پیچھے کوئی چیز نہیں رہی، نوٹ پر لکھی ہوئی عبارت ''حاملِ ہٰذا کو مطالبے پر اتنے روپے ادا کئے جائیں گے'' بے معنی ہوگئی، اب صورتِ حال یہ ہے کہ اب اس کے آلۂ تبادلہ ہونے پر اصطلاح محض ہے، اس کے پیچھے کچھ بھی نہیں ہے۔

اب موجودہ صورتِ حال میں کاغذی نوٹ کی حیثیت کیا ہے؟ اس کی دو تشریحیں کی جاتی ہیں:-

۱- زیادہ ماہرینِ معاشیات یہ کہتے ہیں کہ نوٹ کے پیچھے سونا اس لئے رکھا جاتا تھا کہ سونا بطور آلۂ تبادلہ کے متعارف ہوگیا تھا، ہر جگہ اور ہر ملک میں اس کی بنیاد پر تجارت ہوسکتی تھی، اگر یہی مقصد کاغذی نوٹ سے سونے کو واسطہ بنائے بغیر حاصل ہوجائے اور وہ بطور آلۂ تبادلہ کے متعارف ہوجائے تو سونے کو واسطہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ اس رائے کے مطابق نوٹ ایک خاص قوّتِ خرید سے عبارت ہے، یعنی اس نوٹ سے اتنی قیمت کی اشیاء خریدی جاسکتی ہیں، تو اب نوٹ کے پیچھے سونے کی بجائے غیر متعین، متفرق اشیاء کا مجموعہ ہے، جس کو انگریزی میں "Basket of Goods" اور عربی میں "سلّة البضائع" کہتے ہیں۔

۲- دُوسری تشریح جو فقہی مزاج کے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ نوٹ کو [illegible]

اِصطلاحی اور ثمنِ عرفی قرار دے دیا گیا ہے، یعنی اگرچہ اس کاغذ کی ذاتی قدر نہیں، لیکن اِصطلاحاً اس کو ایک مخصوص مالیت کا آلۂ تبادلہ قرار دے دیا گیا۔

نوٹ کی فقہی حیثیت

نوٹ کی فقہی حیثیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں علماء کے کئی نقطۂ نظر ہیں:-

۱- ماضیٔ قریب میں علمائے ہندوستان میں سے اکثر کی رائے یہ رہی کہ نوٹ خود مال نہیں، بلکہ دَین کی رسید ہے، کسی کو نوٹ دینا دَین کا حوالہ ہے۔ اس پر کئی مسائل متفرّع ہوئے، مثلاً یہ کہ نوٹ دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، جب تک کہ فقیر اس سے کوئی چیز نہ خرید لے، نوٹوں سے سونے اور چاندی کی خریداری جائز نہیں، اس لئے کہ نوٹ بھی سونے کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا یہ بیع صَرف ہوئی اور جس نے نوٹ لئے ہیں اس نے سونے پر ابھی قبضہ نہیں کیا، لہٰذا تقابض فی المجلس نہ ہوا جو بیع صرف کے جواز کی شرط ہے، بلکہ اس رائے کے مطابق دو نوٹوں کا آپس میں تبادلہ بھی جائز نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ بیع الدَّین بالدَّین (بیع الکالیٔ بالکالیٔ) ہے جو ناجائز ہے۔

یہ نقطۂ نظر کسی زمانے میں دُرست تھا، مگر اب بوجوہ دُرست نہیں رہا، اس لئے کہ اب نوٹوں کے پیچھے سونا نہیں ہوتا، بلکہ خود انہی کو ثمن قرار دے دیا گیا ہے، لہٰذا ان کو رسید کہنا مشکل ہے۔

۲- ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ ایک روپیہ کا نوٹ خود مال ہے، اور باقی نوٹ اس کی رسیدیں ہیں، یہ رائے نظریاتی طور پر تو دُرست ہوسکتی ہے، اس لئے کہ ایک روپیہ کے نوٹ میں اور باقی نوٹوں میں فرق ہے۔ ایک روپیہ کا نوٹ حکومت جاری کرتی ہے اور باقی نوٹ اسٹیٹ بینک جاری کرتا ہے۔ بڑے نوٹوں پر یہ لکھا ہوا ہوتا ہے "حاملِ ہذا کو مطالبے پر اتنے روپے دیئے جائیں گے" ایک روپے کے نوٹ پر یہ بات لکھی ہوئی نہیں ہوتی۔ حکومت کو جب پیسے کی ضرورت ہوتی ہے تو حکومت اسٹیٹ بینک سے قرض لیتی ہے، اسٹیٹ بینک نوٹ چھاپ کر قرض دیتا ہے۔ اس فرق کی اس کے علاوہ اور کوئی تشریح بظاہر ممکن نہیں کہ ایک روپے کا نوٹ خود مال ہے اور

باقی نوٹ اس کی رسیدیں ہیں، مگر عملی طور پر بات یوں نہیں ہے۔ اس لئے کہ بڑے نوٹ اس بات کو دیکھ کر نہیں چھاپے جاتے کہ ایک روپے کے نوٹ کتنی مقدار میں ہیں، اتنے ہی بڑے نوٹ چھاپے جائیں، بڑے نوٹوں کا ایک روپے کے نوٹوں سے رابطہ نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ کسی چیز کو ثمنِ عرفی قرار دینے کے لئے اس قسم کی کوئی شرط نہیں ہے کہ وہ کیا چیز ہے، لہٰذا اگر کسی رسید کو ثمن قرار دے دیا جائے تو اس پر بھی ثمنِ عرفی کے اَحکام جاری کئے جانے چاہئیں۔

۳- اکثر علمائے عرب کی رائے یہ ہے کہ نوٹ ذہب اور فضہ کے قائم مقام ہیں، جو اَحکام سونے چاندی کے ہیں وہی نوٹوں کے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سونا، چاندی تو آلۂ تبادلہ نہیں رہے، سونے، چاندی کی جگہ اب نوٹوں نے لے لی ہے، لہٰذا زکوٰۃ، بیع صَرف اور ربوا وغیرہ تمام مسائل میں نوٹوں کا حکم سونے، چاندی والا ہوگا۔ علمائے عرب میں سے بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ سونا، چاندی اب ثمن نہیں رہے، بلکہ عروض ہیں، ان پر عروض والے اَحکام جاری ہوں گے۔ یہ نظریہ اس نقطۂ نظر پر مبنی ہے کہ کوئی چیز بھی ثمنِ خلقی نہیں ہوتی، کسی چیز کو لوگ آلۂ تبادلہ کے طور پر قبول کرنے لگیں تو وہ ثمن ہے، یہ مقبولیت ختم ہوجائے تو اس کی ثمنیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

یہ نقطۂ نظر بھی دُرست معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ سونے، چاندی اور نوٹوں میں فرق ہے۔ سونے، چاندی کو ثمنِ خلقی کہا جائے یا نہ کہا جائے یہ الگ بات ہے، لیکن اتنی بات طے شدہ ہے کہ سونے چاندی کو شریعت نے ثمنِ حقیقی قرار دیا ہے، ثمنِ حقیقی ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی ثمنیت اس کے عرفاً آلۂ تبادلہ کے طور پر معتبر ہونے کے ساتھ وابستہ نہیں۔ لوگ اس کو آلۂ تبادلہ اعتبار کریں یا بطور سلعہ استعمال کریں، شرعاً اس کا حکم ایک ہی ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ سونے، چاندی کا زیور سونے، چاندی کے بدلے میں بیچا جائے تو بھی اس پر صَرف کے اَحکام جاری ہوں گے، حالانکہ یہاں یہ آلۂ تبادلہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ سونا اور چاندی ثمنِ حقیقی اور ثمنِ شرعی ہیں، جبکہ نوٹ اعتباری ثمن ہیں، لہٰذا نوٹوں کو سونے، چاندی کے قائم مقام قرار دینا بھی صحیح نہیں، اور

یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ سونے، چاندی کی ثمنیت ختم ہوچکی ہے۔

۴- صحیح نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوٹ رسید نہیں بلکہ خود مال ہیں، سونے چاندی کی طرح ثمنِ حقیقی نہیں بلکہ ثمنِ عرفی ہیں، ان کا حکم وہی ہوگا جو فلوس کا ہوتا ہے، اس نقطۂ نظر کے مطابق نوٹوں کے مسائل کی اجمالی وضاحت یہ ہے۔

نوٹ چونکہ خود مال ہیں، لہٰذا ان کے دینے سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے، اور ان کا آپس میں تبادلہ بیع صَرف نہیں ہوگا، جب یہ معلوم ہوگیا کہ نوٹوں کا تبادلہ صَرف نہیں، تو ان کے باہمی تبادلے کا کیا حکم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نوٹوں کے تبادلے کی دوصورتیں ہیں، ایک یہ کہ ایک ہی ملک کے دونوٹوں میں تبادلہ ہو، جیسے سو کے پاکستانی نوٹ کا تبادلہ دس دس روپے کے دس نوٹوں سے۔ دُوسری صورت یہ ہے کہ ایک ملک کی کرنسی کا دُوسرے ملک کی کرنسی سے تبادلہ ہو۔

پہلی صورت کا حکم یہ ہے کہ چونکہ یہ بیعِ صَرف نہیں، اس لئے تقابض فی المجلس تو ضروری نہیں، تاہم احد البدلین پر مجلس میں قبضہ ضروری ہے تاکہ بیع الدّین بالدّین لازم نہ آئے[1]۔ اب سوال یہ ہے کہ اس تبادلے میں تفاضل جائز ہے یا نہیں؟ مثلاً سو روپے کا تبادلہ نوّے روپے سے جائز ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دونوں بدل غیر متعین ہوں تو حنفیہ کے تینوں ائمہ کے ہاں تفاضل جائز نہیں اس لئے کہ فلوس میں جودۃ رداءۃ کا تو اعتبار ہے نہیں، لہٰذا یہ امثال متساویہ ہیں قطعاً،

---

(۱) یہ حکم تنویر الابصار، الدر المختار اور حاشیہ ابنِ عابدین پر اعتماد کر کے لکھا گیا تھا، بعد میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحریر میں علامہ کاسانی رحمہ اللہ کے حوالے سے یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ اگرچہ یہ صَرف نہ ہو، لیکن رِبا کی دوعلتوں میں سے ایک علت یعنی اتحادِ جنس یہاں پائی جارہی ہے، اس لئے نسیہ جائز نہیں۔ چنانچہ ایک ملک کی کرنسی کا اگر باہم تبادلہ ہو تو دونوں طرف سے قبضہ ضروری ہے، صرف احد البدلین پر قبضہ کافی نہیں ہے۔ چنانچہ بندہ نے ''البلاغ'' کے شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۲ھ میں اس مسئلے سے رُجوع کا اعلان کردیا تھا۔ ''البلاغ'' کے مذکورہ شمارے میں اس کے مفصل دلائل مذکور ہیں۔ محمد تقی عثمانی
۱۴۲۶/۱۰/۱۲ھ

یہاں ایک بدل کی زیادتی دُوسرے بدل کے وصفِ جودۃ کے مقابلے میں تو ہو نہیں سکتی، اس لئے کہ وصفِ جودۃ ہدر ہے، لہٰذا یہ زیادتی خالی عن العوض ہے، اسی کو ربا کہتے ہیں ـــــ اگر دونوں بدل متعین ہوں تو شیخینؒ کے ہاں تفاضل جائز ہے، اور اگرچہ تقابض شرط نہیں، کیونکہ دونوں متعین ہوگئے ہیں لیکن نسیۂ حرام ہے، لہٰذا اگر نسیۂ کی شرط کے بغیر تقابض میں تعین کے بعد کچھ تاخیر ہوجائے تو جائز ہے ان کے ہاں متعاقدین کی تعیین سے ان کی ثمنیت باطل ہوگئی، اب یہ عروض بن گئے ہیں، اس لئے ان میں تفاضل جائز ہے۔ اِمام محمدؒ کے ہاں اس صورت میں بھی تفاضل جائز نہیں، ان کی تعیین سے ان کی ثمنیت باطل نہیں ہوتی۔ آج کل اِمام محمدؒ کی رائے پر ہی فتویٰ دینا چاہئے، اس لئے کہ اگر شیخینؒ کا قول اختیار کرلیا جائے تو ربا کا دروازہ کھل جائے گا۔ چنانچہ فقہائے متقدمین میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ فقہائے ماوراء النہر نے ''عدالی'' اور ''غطارفہ'' میں تفاضل کی حرمت کا فتویٰ دیا تھا، حالانکہ ان میں غش غالب ہوتا تھا اور ایسے نقود میں اصل مذہب کے مطابق تفاضل جائز ہے۔ سدِّ بابِ ربا کے لئے تفاضل کو حرام قرار دیا گیا ہے، ایسے ہی فلوس میں تفاضل کے بارے میں بھی اِمام محمدؒ کے قول پر فتویٰ دینا چاہئے۔ لہٰذا ایک ملک کے نوٹوں کی بیع میں تفاضل جائز نہیں، تماثل ضروری ہے، اور یہ تماثل نوٹوں کی گنتی سے نہیں ہوگا، بلکہ ان پر لکھی ہوئی قیمت (Face Value) کے مطابق ہوگا۔

دُوسری صورت کا حکم یہ ہے کہ دوملکوں کی کرنسی کے تبادلے میں تفاضل جائز ہے، بشرطیکہ احد البدلین پر قبضہ ہوجائے، اس لئے کہ دوملکوں کی کرنسیوں کی جنس مختلف ہوتی ہے، کیونکہ خود نوٹ تو مقصود ہوتے نہیں، بلکہ یہ مخصوص قوتِ خرید کی نمائندگی کرتے ہیں، اور ہر ملک کی کرنسی کی قوتِ خرید مختلف ہوتی ہے، لہٰذا ہر ملک کی کرنسی الگ جنس شمار ہوگی اور ان کے باہمی تبادلے میں تفاضل جائز ہے۔

حکومتیں بھی دُوسرے ممالک کی کرنسیوں کا اپنے ملک کی کرنسی سے ریٹ طے کردیتی ہیں۔ اس ریٹ سے کم وبیش پر معاملہ کرنا سود تو نہیں، البتہ خلافِ قانون ہونے اور اِمام کی جائز اُمور میں اِطاعت نہ کرنے کی وجہ سے گناہ ہے۔ اس مسئلے کی مزید تفصیل احقر کے رسالے "احکام الأوراق النقدیة" میں موجود ہے، جس کا اُردو ترجمہ بھی چھپ چکا ہے۔

قدرِ زَر، اِفراط وتفریطِ زر

اور قیمتوں کا اِشاریہ

سابقہ تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کاغذی نوٹ (Paper Currency) کی اپنی حقیقی قدر کچھ نہیں، یہ کچھ اشیاء وخدمات (Good and Services) کی قوتِ خرید کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اسی قوتِ خرید کو "زَر کی قدر" (Value of Money) کہتے ہیں۔ نوٹ کی قدر کا تعین اشیاء وخدمات کی قیمتوں سے ہوتا ہے، اشیاء وخدمات کی قیمتیں کم ہوجائیں تو نوٹ کی قدر بڑھ جاتی ہے، اور اَشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں تو نوٹ کی قدر کم ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اَشیاء و خدمات کی قیمتیں اور نوٹ کی قدر دونوں متضاد سمتوں میں سفر کرتے ہیں۔ جب "زَر" کا پھیلاؤ زیادہ ہوجائے تو اَشیاء کی طلب بڑھتی ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے، اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے زَر کی قدر میں کمی آجاتی ہے، اس صورتِ حال کو اُردو میں "اِفراطِ زَر" اور عربی میں "تضخم" اور انگریزی میں "Inflation" کہتے ہیں۔ پھر اصطلاح میں عموم ہوا تو اس کو اَشیاء کی قیمتوں میں ہر اِضافے کے لئے استعمال کرتے ہیں، خواہ وہ اِضافہ زَر کے زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے ہو یا دیگر عوامل کی وجہ سے۔ اگر اِفراطِ زَر (قیمتوں میں اِضافہ) اشیاء کی طلب بڑھ جانے کی وجہ سے ہو تو اس کو "Demand Pull Inflation" اور عربی میں "تضخم بسبب الطلب" کہتے ہیں۔ اور اگر اِفراطِ زَر اَشیاء کی تیاری کے مصارف میں اِضافے کی وجہ سے ہو مثلاً مزدور کی اُجرت بڑھ جانے کی وجہ سے تو اس کو "Cost Push Inflation" اور عربی میں "تضخم بسبب رفع الأسعار" کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر قیمتوں میں کمی ہوجائے اور زَر کی قدر میں اِضافہ ہو تو اس کو اُردو میں "تفریطِ زَر"، عربی میں "انکماش" اور انگریزی میں "Deflation" کہتے ہیں۔

قیمتوں کا اِشاریہ

زَر کی قدر، اِفراطِ زَر اور تفریطِ زَر کی پیائش اشیاء و خدمات کی قیمتوں سے ہوتی ہے، اشیاء کی قیمتوں کو دیکھ کر قدرِ زَر اور اِفراطِ زَر یا تفریطِ زَر کی پیائش کے لئے ایک حسابی نظام ہے جس کو عربی میں "قائمة الأسعار"، اُردو میں ''قیمتوں کا اِشاریہ'' اور انگریزی میں "Price Index" کہتے ہیں۔

اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی اشیاء جو عام ضرورت کی ہیں اور ان کی قیمتوں میں کمی بیشی لوگوں کو زیادہ متاثر کرتی ہے، ان کی فہرست بنائی جاتی ہے، پھر جس مدّت کے دوران زَر کی قدر میں کمی بیشی کا اندازہ لگانا ہے، اس مدّت کی اِبتداء اور اِنتہاء کی قیمتیں لے کر ان کا اوسط معلوم کیا جاتا ہے، یعنی یہ دیکھا جاتا ہے کہ اسی مدّت کے دوران قیمتوں میں اوسطاً کتنے فیصد اِضافہ یا کمی ہوئی۔ یہ قیمتوں میں اضافے یا کمی کی سادہ اوسط ہے، اس سے قدرِ زَر کی صحیح پیائش نہیں ہوسکتی، اس لئے کہ یہ اوسط حاصل کرنے کے لئے تمام اشیاء کو یکساں رکھا گیا ہے، حالانکہ تمام اشیاء کی قیمتوں میں کمی بیشی انسان کو یکساں طور پر متاثر نہیں کرتی، جن اشیاء کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے ان کی قیمتوں میں کمی بیشی زیادہ متاثر کرتی ہے، اور جن کی اہمیت و ضرورت کم ہے ان کی قیمتوں میں کمی بیشی اتنی زیادہ متاثر نہیں کرتی، لہٰذا صحیح پیائش کے لئے ہر شے کی اہمیت کے مطابق اس کو ایک وزن دیا جاتا ہے، اس وزن کو عربی میں ''وزن البضائع'' اور انگریزی میں "Weight of Commodity" کہتے ہیں۔ اس وزن کو سادہ اوسط میں ضرب دے کر جو اُوسط حاصل ہوگا اس کو ''وزن دار اوسط'' کہتے ہیں، عربی میں ''المعدل الموزون'' اور انگریزی میں "Weighted Average" کہتے ہیں۔ اس موزون اوسط کا مجموعہ قیمتوں میں کمی بیشی کا اِشاریہ ہوگا، اس سے قدرِ زَر میں کمی بیشی کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ درج ذیل خاکے سے "Price Index" کا اجمالی تصوّر ہوسکتا ہے:-

اشیاء	۱۹۹۱ء کی قیمت	۱۹۹۲ء کی قیمت	سادہ اوسط	وزن	موزون اوسط
کھانا	۵۰	۱۰۰	۲	۵ء	۱ء۰۰
کپڑا	۲۰	۳۰	۱ء۵	۲ء	۳ء
مکان	۳۰	۶۰	۲	۳ء	۶ء
			مجموعے کی اوسط=۱ء۸۳		مجموعہ=۱ء۹

سادہ اوسط سے یہ معلوم ہوا کہ قیمتیں ایک سے ۱ء۸۳ ہوگئی ہیں، لہٰذا قدرِ زَر میں ۸۳ فیصد کمی آئی، اور موزون اوسط سے یہ معلوم ہوا کہ قیمتیں ایک سے ۱ء۹۰ ہوگئی ہیں، لہٰذا زر کی قدر میں ۹۰ فیصد کمی ہوئی۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ "قیمتوں کا اِشاریہ" ایک تخمینی چیز ہے، تحقیقی نہیں، اس لئے کہ اس میں کونسی اشیاء لینی ہیں، اس کا فیصلہ تخمینی ہے، پھر ہر شئے کو جو وزن دیا جاتا ہے وہ بھی تخمینی، ہر شئے کی جو قیمت لی جاتی ہے وہ بھی تخمینی ہے۔

بسااوقات کئی معاملات کو "قیمتوں کے اِشاریے" سے وابستہ کردیا جاتا ہے، جیسے کسی وقت پاکستان میں ملازمین کی تنخواہوں کو "قیمتوں کے اِشاریے" سے وابستہ کردیا گیا تھا کہ روپے کی قدر میں جتنی کمی ہوگی، اتنا ہی تنخواہوں میں اضافہ ہوگا، کسی چیز کی قیمتوں کے اِشاریے سے وابستہ کرنے کو "انڈیکسیشن" (Indexation) کہتے ہیں۔

اِفراطِ زَر کا ادائیگیوں پر اثر

نوٹ کی ایک وہ قیمت ہے جو اس کے اُوپر لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس کو "القیمة الإسمیة" (Face Value) کہتے ہیں، اور ایک قوّتِ خرید ہے، اس کو "القیمة الحقیقیة" (Real Value) کہتے ہیں۔ لکھی ہوئی قیمت تو ایک ہی رہتی ہے، مگر حقیقی قیمت (قوّتِ خرید) اِفراطِ زَر کی صورت میں کم ہوتی ہے۔ اب کسی شخص کا دُوسرے کے ذمے دَین ہو تو وہ کچھ مدّت کے بعد قیمتِ اِسمیہ کے مطابق واپس کیا جائے یا قوّتِ خرید کے مطابق؟ مثلاً کسی شخص کے دُوسرے کے ذمے سو روپے تھے، ایک سال کے بعد سو روپے کی قوّتِ خرید میں دس فیصد کمی آگئی تو قیمتِ اِسمیہ کے مطابق تو سو کا

نوٹ ہی دینا ہوگا اور قیمتِ حقیقیہ کے مطابق ایک سو دس روپے دینے ہوں گے۔ یہ سوال آج کل بہت زیادہ اُٹھ رہا ہے کہ ادائیگی قیمتِ اسمیہ کے لحاظ سے ہوگی یا قیمتِ حقیقیہ کے لحاظ سے؟ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قیمتِ اسمیہ کے ساتھ ادائیگی ہو تو اس میں قرض خواہ کا نقصان ہے اور اس پر ظلم ہے، خاص طور پر ان ممالک میں جہاں افراطِ زر کی شرح بہت تیز ہے۔ مثلاً بیروت کی کرنسی ''لیرا'' ایک وقت ڈالر کے قریب تھی، اب اس کی قدر اتنی کم ہوگئی ہے کہ ایک ڈالر کے چھ سات سو لیرے ملتے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے اِقتصادیین اور علماء نے مختلف نقطۂ نظر اپنائے ہیں، یہاں تمام نقطہ ہائے نظر ذکر کئے جاتے ہیں اور ان پر تبصرہ بھی کیا جاتا ہے۔

۱- نوٹ قرض دیئے جائیں تو یہ دراصل وہ سونا قرض دیا گیا ہے جو اس کی پشت پر ہے، اب اسی مقدار کا سونا لینا اس کا حق ہے، وہ اتنا ہی سونا یا اس کی قیمت روپے میں لے سکتا ہے۔ لیکن یہ نقطۂ نظر اس مفروضے پر مبنی ہے کہ نوٹ کی پشت پر سونا ہے، اور اس مفروضے کا غلط ہونا پہلے واضح ہو چکا ہے۔

۲- نوٹ کی پشت پر سونا ہو یا نہ ہو، بہرحال سمجھا یہی جائے گا کہ نوٹ کا لین دین دراصل سونے کا لین دین ہے، اس لئے کہ پہلے سونا ثمن تھا، اب نوٹوں نے سونے کی جگہ لے لی ہے، لہٰذا نوٹ کا لین دین سونے کا لین دین ہے، لہٰذا ادائیگی سونے کی قیمت سے وابستہ ہے۔

یہ نقطۂ نظر بھی دُرست معلوم نہیں ہوتا، کیونکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ اب نوٹ سونے کی نمائندگی نہیں کرتے ہیں۔ یہ خود ثمنِ عرفی ہے اور فلوس کی طرح ہیں۔ ثمنِ عرفی اور فلوس کی اپنی ذاتی قدر کا اِعتبار ہوتا ہے، ان کو اَدائیگی میں سونے سے وابستہ نہیں کیا جاتا ہے۔ یہاں بعض لوگ حضرت اِمام ابویوسف رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب سے اِستدلال کرتے ہیں، ان کا مذہب یہ ہے کہ ادائیگی سے پہلے فلوس کی قیمت بڑھ گئی یا کم ہوگئی تو ادائیگی قیمت کے اعتبار سے ہوگی۔[1] لیکن یہ اِستدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ نوٹ اور فلوس میں فرق ہے۔ ''فلوس'' سونے چاندی سے

(۱) رسائل ابنِ عابدین ج:۲ ص:٦۔

مرتبط ہوتے تھے، فلوس کی قیمت سونے چاندی کی بنیاد پر ہی طے ہوتی تھی، لہٰذا ان فلوس کی حیثیت دَنانیر اور دَراہم کی ریزگاری کی طرح تھی، اور فلوس کو دَراہم و دَنانیر کے ساتھ ایک خاص نسبت ہوتی تھی، مثلاً یہ کہ ایک فلس چاندی کے درہم کا عشر (دسواں حصہ) ہے، بازار کی اِصطلاح میں اس نسبت کے بدلنے کو ہی فلوس کی قیمت میں کمی بیشی سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں جبکہ فلوس سونے چاندی سے مرتبط ہوں اور دَراہم و دَنانیر کے لئے ریزگاری کی طرح ہوں، اِمام ابویوسفؒ فلوس کی قیمت کی ادائیگی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ نوٹوں کی صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے، یہ سونے چاندی سے مرتبط نہیں، یہ مستقل ثمنِ اِصطلاحی ہیں، ان کی اپنی ایک قدر ہے جس کا سونے چاندی سے کوئی تعلق نہیں۔

پھر اس زمانے کے فلوس اور نوٹوں میں ایک اور فرق بھی ہے، وہ یہ کہ فلوس کی قیمت معلوم کرنے کے لئے ایک واضح معیار سونے چاندی کا موجود تھا، جس کو سامنے رکھ کر فلوس کی قیمت تحقیقی طور پر معلوم کی جاسکتی تھی، لیکن اب نوٹوں کی قدر کا تخمینی اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے، قدر کا حقیقی علم نہیں ہوسکتا، جیسا کہ قیمتوں کے اشاریے کے مضمون میں یہ بات واضح ہوچکی ہے۔

۳- تیسرا نقطۂ نظر جو زیادہ شدّ و مدّ سے پیش کیا جاتا ہے، وہ انڈیکسیشن کا نظریہ ہے، یعنی ادائیگیوں کو ''قیمتوں کے اشاریے'' (Price Index) سے وابستہ کیا جائے۔ اس نظریے کی دلیل یوں پیش کی جاتی ہے کہ نوٹ بذاتِ خود کچھ نہیں، یہ ''سلّة البضائع'' (Basket of Goods) یعنی کچھ اشیاء کی ٹوکری کی قوتِ خرید کی نمائندگی کرتے ہیں، لہٰذا جب کسی نے دُوسرے کو کچھ نوٹ قرض دیئے تو گویا اس نے اس کو ''سلّة البضائع'' (Basket of Goods) دی ہے، ''الأقراض تقضی بأمثالها'' کا تقاضا یہ ہے کہ اب یہی "Basket of Goods" واپس کرے، جس کا طریقہ یہی ہے کہ ادائیگی کو "Price Index" (قیمتوں کے اِشاریے) سے وابستہ کیا جائے، یعنی ادائیگی کے وقت نوٹوں کی اتنی مقدار زیادہ ادا کی جائے جو اِفراطِ زَر کی شرح کے مساوی ہو، مثلاً سو روپے قرض دیئے تھے، اور ادائیگی کے وقت اِفراطِ زَر میں دس فیصد

اِضافہ ہوا تو اَب ایک سو دس روپے ادا کئے جائیں۔

فقہی لحاظ سے یہ نقطۂ نظر بھی بوجوہ غلط ہے۔

پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اگر نوٹ کی پشت پر کچھ مخصوص اور متعین اشیاء ہوتیں تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ نوٹ دراصل "سلّة البضائع" کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن پیچھے واضح کیا جاچکا ہے کہ یہ "سلّة البضائع" کوئی متعین چیز نہیں، یہ افراد کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے اور اس کی تعیین کا کوئی طریقہ بجز تخمینے کے نہیں ہے، لہٰذا دراصل "سلّة البضائع" نوٹ کی حقیقت نہیں، بلکہ اس سے حاصل ہونے والا فائدہ ہے، چنانچہ کسی کو نوٹ دینے کا مطلب "سلّة البضائع" دینا نہیں بلکہ ایسا آلۂ تبادلہ دینا ہے جس سے "سلّة البضائع" خریدی جاسکتی ہے۔

دُوسری وجہ یہ ہے کہ اس نظریے کا حاصل یہ ہے کہ ادائیگی میں مثلیت باعتبار قیمتِ حقیقیہ (Real Value) معتبر ہونی چاہئے، صرف قیمتِ اِسمیہ (Face Value) میں مثلیت کا اعتبار دُرست نہیں۔ شرعی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو بات اس کے برعکس ہے، شرعاً قرض کی ادائیگی میں مقدار میں مثلیت کا اعتبار ہے، حقیقی قیمت میں مثلیت کا اعتبار نہیں۔ مثلاً کسی نے گندم قرض لی، جب واپسی کا وقت آیا تو وہ گندم کی اتنی مقدار ہی واپس کرے گا خواہ قیمت کم ہو یا زیادہ۔ اس بات پر کہ اعتبار مقدار کا ہوتا ہے، حقیقی قیمت کا نہیں، ایک کافی واضح دلیل حضرت ابنِ عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ "بقیع" میں اُونٹ بیچا کرتے تھے، کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ بیع دَراہم پر ہوتی اور ادائیگی دَنانیر میں ہوتی، اور کبھی بیع دَنانیر میں ہوتی اور ادائیگی دَراہم میں ہوتی، اس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تو آپ نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ اُداء کے دن کی قیمت کے مطابق ہو۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ ذمے میں تو اسی چیز کی مقدار واجب ہوئی ہے، جس پر بیع ہوئی تھی، پھر اُدا کے وقت اس دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوسکتا ہے، معلوم ہوا کہ دیون میں جو چیز واجب ہوتی ہے وہ دیون کی مقدار ہے نہ کہ قیمت، اگر قیمت

(۱) ابوداؤد، کتاب البیوع ج:۳ ص:۲۵۰ رقم:۳۳۵۴۔

واجب ہوتی تو وجوب کے دن کی قیمت کے لحاظ سے تبادلہ ہوتا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اَموالِ رِبویہ میں شریعت نے حقیقی مماثلت کو ضروری قرار دیا ہے، اس لئے شریعت نے اَموالِ رِبویہ میں مجازفۃ کو جائز نہیں قرار دیا، اور ادائیگی کو ''قیمتوں کے اِشاریے'' کے ساتھ وابستہ کرنے میں مجازفۃ لازم آتی ہے، اس لئے کہ یہ بات پہلے واضح ہوچکی ہے کہ ''قیمتوں کا اِشاریہ'' تخمینی ہوتا ہے۔

رہا یہ اِشکال کہ نوٹ کی قوتِ خرید کم ہونے کے بعد بھی نوٹوں کی اتنی ہی مقدار واپس کرنا جتنی لی تھی، قرض خواہ پر ظلم ہے، اس کے جواب کے لئے درج ذیل باتیں ذہن میں رہنا مفید ہے:-

الف:- روپے کی قدر کم ہونے میں مستقرض کے کسی بھی فعل کا دخل نہیں، لہٰذا اس کی ذمہ داری اس پر ڈالنا اس پر ظلم ہے۔

ب:- کسی کو رقم دینے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کسی کے منافع میں شریک ہونے کے لئے کسی کو رقم دی جائے، تو منافع میں شریک ہونے کا طریقہ قرض نہیں، بلکہ شرکت یا مضاربت ہے۔ دُوسری صورت یہ ہے کہ ہمدردی کے لئے کسی کو قرض دیا جائے، ہمدردی کے لئے کسی کو قرض دینا بالکل ایسے ہی ہے جیسے اپنے پاس رقم محفوظ کرلی جائے، اگر قرض دینے والا اپنے پاس رقم محفوظ رکھتا تو قدر میں کمی کا کوئی بھی ذمہ دار نہیں تھا، یہاں بھی کوئی ذمہ دار نہیں ہوگا۔

ج:- اگر انڈیکسیشن صحیح اُصول ہے تو یہ بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں بھی جاری ہونا چاہئے، حالانکہ کرنٹ اکاؤنٹ میں اسے کوئی بھی جاری نہیں کرتا ہے۔

د:- اِفراطِ زَر (Inflation) کی صورت میں جیسے زیادہ ادائیگی کو ضروری سمجھا جاتا ہے تو تفریطِ زَر (Deflation) کی صورت میں ادائیگی میں کمی بھی ہونی چاہئے، حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔

البتہ جہاں کسی کرنسی کی قیمت اس حد تک گرجائے کہ کساد میں داخل ہوجائے جیسا کہ بیروت میں ہوا ہے، تو اس کا حکم مختلف ہوسکتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات اور علماء کے لئے قابلِ غور ہے، اور وہ یہ کہ زَر کی

قیمت میں کمی بعض اوقات اس طرح ہوتی ہے کہ خود حکومت اپنے سکے کی قیمت گرادیتی ہے، جسے "Devaluation" کہتے ہیں، اس صورت میں یہ پہلو غور طلب ہے کہ کیا اس صورت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب حکومت نے پہلے سکے کو باطل کرکے ایک نیا سکہ جاری کیا ہے جس کی قیمت پہلے سکے سے کم ہے؟ اگر سکے کی قیمت میں حکومت کی طرف سے کمی کرنے کی یہ تشریح کی جاسکتی ہو تو اس وقت یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرض کی ادائیگی سابق سکے کی قیمت کے برابر نئے سکے میں کی جائے۔ مثلاً کسی نے سو روپے اس وقت قرض لئے تھے جب سو روپے چار ڈالر کے برابر تھے، بعد میں حکومت نے روپے کی قیمت گرا کر اسے تین ڈالر کے برابر کردیا، گویا ایک ایسا نیا سکہ جاری کیا جو پہلے سکے کے مقابلے میں ۳۳ فیصد کم ہے، لہٰذا اب اس نئے سکے کے ذریعے قرض کی ادائیگی کی جائے تو ۱۳۳ روپے دیئے جائیں۔ یہ مسئلہ اہلِ علم کے لئے قابلِ غور ہے، لیکن اس کا فیصلہ کرتے وقت یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ حکومت کی طرف سے روپے کی قیمت گرانے کا براہِ راست اثر صرف بیرونی کرنسی کی شرح تبادلہ پر پڑتا ہے، اندرونی معاملات پر اس کا اثر بالواسطہ ہوتا ہے۔ دُوسرے یہ کہ حقیقتاً نیا سکہ جاری نہیں کیا جاتا، بلکہ پُرانے سکوں یا نوٹوں ہی کی قیمت میں تبدیلی کردی جاتی ہے، لیکن چونکہ نوٹ کی جو کچھ بھی قیمت ہے وہ اعتباری ہے، حقیقی نہیں، اس لئے حکومت کے اعلان سے معنوی طور پر وہ نوٹ بدل جاتا ہے۔

***

بینکاری

(Banking)

بینک کی تعریف

''بینک'' ایک ایسے تجارتی اِدارے کا نام ہے جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کر کے تاجروں، صنعت کاروں اور دیگر ضرورت مند اَفراد کو قرض فراہم کرتا ہے۔ آج کل روایتی بینک ان قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں، اور اپنے امانت داروں کو کم شرح پر سود دیتے ہیں، اور سود کا درمیانی فرق بینکوں کا نفع ہوتا ہے۔

بینک کی تاریخ

نظامِ زَر کے اِرتقاء پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ لوگ اپنا سونا صرّافوں کے پاس بطورِ اَمانت رکھ دیتے تھے، اور سنار اس کی رسید لکھ دیتے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان رسیدوں سے ہی معاملات شروع ہوگئے، لوگ سونا واپس لینے کے لئے کم آتے تھے، تو یہ صورتِ حال دیکھ کر صرّافوں نے سونا قرض دینا شروع کردیا، پھر جب یہ دیکھا کہ لوگ عموماً رسیدوں سے ہی معاملات کرتے ہیں تو صرّافوں نے بھی قرض خواہوں کو سونے کی بجائے رسیدیں دینی شروع کردیں، اس طرح بینک کی صورت پیدا ہوئی، بعد میں اسی کو ایک منظّم اِدارے کی شکل دے دی گئی۔

بینک کا قیام

بینک بھی بنیادی طور پر ''جوائنٹ اسٹاک کمپنی'' ہے، اس کے قیام کا طریقہ وہی ہے جو کمپنی کے قیام کا ہوتا ہے۔

بینک لوگوں کو اپنی امانتیں جمع کرانے کی دعوت دیتا ہے، (جو فقہی طور پر قرض ہی ہوتا ہے) ان کو اُردو میں ''امانتیں''، عربی میں ''ودائع'' اور انگریزی میں "Deposits" کہتے ہیں، ڈپازٹ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں:-

۱- "Current Account" (کرنٹ اکاؤنٹ) اس کو عربی میں ''الحساب الجاری'' اور اُردو میں ''مدّرواں'' کہتے ہیں، اس میں رکھی ہوئی رقم پر سود نہیں ملتا ہے، اس اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم کسی وقت بھی، جتنی مقدار میں چاہیں بغیر کسی پابندی کے نکلوائی جاسکتی ہے۔

۲- "Saving Account" جس کو عربی میں ''حساب التوفیر'' اور اُردو میں ''بچت کھاتہ'' کہتے ہیں، اس میں رقم نکلوانے پر عموماً مختلف پابندیاں ہوتی ہیں، اس پر بینک سود دیتا ہے۔

۳- "Fixed Deposit" جس کو عربی میں ''ودائع ثابتۃ'' کہتے ہیں، اس میں مقرّرہ مدّت سے پہلے رقم واپس نہیں لی جاسکتی، اس میں بھی بینک سود دیتا ہے، اور سود کی شرح مدّت کے مطابق ہوتی ہے، طویل مدّت میں شرح زیادہ ہوتی ہے، اور کم مدّت پر شرح کم ہوتی ہے۔

جب ان تین قسم کے ڈپازٹ سے بینک کے پاس سرمایہ جمع ہوجاتا ہے اور کچھ بینک کا اِبتدائی سرمایہ بھی ہوتا ہے تو اس تمام سرمائے کو اِستعمال کرنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس سرمائے کا ایک مقرّرہ حصہ سیال شکل میں اسٹیٹ بینک کے پاس جمع کرانا ضروری ہوتا ہے، مرکزی بینک میں یہ سرمایہ عموماً ایسے سرکاری تمسکات کی شکل میں رہتا ہے جو بآسانی نقد میں تبدیل کئے جاسکیں اور ان پر کچھ سود بھی ملتا رہے۔ مرکزی بینک یہ طے کرتا ہے کہ تجارتی بینک اپنی امانتوں کا کتنے فیصد حصہ مرکزی بینک میں رکھیں گے، حالات کے لحاظ سے یہ تناسب بدلتا رہتا ہے، آج کل امانتوں کا تقریباً چالیس فیصد حصہ اسٹیٹ بینک میں رکھوانا پڑتا ہے۔ اسٹیٹ بینک تمام بینکوں کو اس بات کا پابند بناتا ہے، اس لئے کہ بینک میں بے شمار اَفراد کی رقمیں ہوتی ہیں، اسٹیٹ بینک کے فرائض میں داخل ہے کہ ڈپازیٹر کے مفادات کا تحفظ کرے۔ سیال سرمائے

سے مراد وہ سرمایہ ہے جو نقد ہو یا جلدی نقد پذیر ہو۔ اس کو عربی میں ''السیولۃ''، انگریزی میں "Liquidity" اور اُردو میں ''نقد پذیری'' کہتے ہیں۔ اس میں کیش، دوسرے بینک میں اکاؤنٹس اور ایسی دستاویزات شامل ہیں جو بہ سہولت نقد میں تبدیل ہوسکتی ہوں، جیسے سرکاری تمسکات وغیرہ۔ پھر بینک کچھ سیال سرمایہ اپنے پاس بھی رکھتا ہے، تاکہ ڈپازیٹر کے مطالبات پورے کرسکے۔

بینک کے وظائف

بینک سرمایہ جمع کرنے کے بعد کئی وظائف ادا کرتا ہے، مثلاً تمویل، تخلیقِ زر، برآمد، درآمد میں واسطہ بننا وغیرہ، یہاں ان وظائف کی قدرے وضاحت کی جاتی ہے۔

تمویل (Financing)

بینک کا سب سے اہم کام لوگوں کو ان کی ضروریات، خصوصاً تجارتی ضروریات کے لئے قرضے فراہم کرنا ہے۔ بینک کبھی طویل المیعاد قرضے جاری کرتا ہے، ایسے قرضوں کو عربی میں ''ائتمان طویل الأجل'' اور انگریزی میں "Long Term Credit" کہتے ہیں۔ اور کبھی قصیر المیعاد قرضے جاری کرتا ہے، جو عموماً تین ماہ یا چھ ماہ تک کے لئے ہوتے ہیں، ان کو عربی میں ''ائتمان قصیر الأجل'' اور انگریزی میں "Short Term Credit" کہتے ہیں۔

بینک سے لوگ تین طرح کے قرضے لیتے ہیں:۔

۱- روزمرّہ کی تجارتی ضروریات کے لئے قرض لیا جاتا ہے، مثلاً بلوں کی ادائیگی یا تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جاتا ہے۔ ان کو "Over Head Expences" کہتے ہیں۔

۲- کاروبار کے رواں اخراجات مثلاً سامانِ تجارت کی خریداری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان کو عربی میں ''راس المال العامل'' اور انگریزی میں "Working Capital" کہتے ہیں۔

۳- بڑے بڑے منصوبوں کے لئے جو قرض لئے جائیں، ان کو عربی میں

"تمویل المشاریع" اور انگریزی میں "Project Financing" کہتے ہیں۔

قرض دینے کا طریق کار

بینکوں کو قرض دینے کا غیر محدود اختیار نہیں ہوتا کہ جہاں چاہیں اور جتنی مقدار میں چاہیں قرض فراہم کریں، بلکہ مرکزی بینک کی طرف سے ایک حد مقرر ہوتی ہے، اس کے پابند رہتے ہوئے بینک قرضے فراہم کرسکتے ہیں، اس حد کو عربی میں "سقف الإعتماد" اور انگریزی میں "Credit Ceiling" کہتے ہیں۔ مثلاً آج کل مرکزی بینک کی طرف سے جو ہدایت ہے وہ یہ ہے کہ بینک اپنی تمام امانتوں کا چالیس فیصد (۴۰٪) تو مرکزی بینک کے پاس رکھواتا ہے، جس کو عربی میں "احتیاطی السیولة" اور انگریزی میں "Liquidity Reserve" کہتے ہیں۔ اور پانچ فیصد بینک اپنے پاس نقد (Cash) کی شکل میں رکھتا ہے۔ اور تیس فیصد (۳۰٪) کی حد تک پرائیویٹ افراد یا اداروں کو قرض فراہم کرسکتا ہے۔ باقی پچیس فیصد (۲۵٪) سے یا تو سرکاری تمسکات خریدے یا سرکاری اداروں کو قرضہ فراہم کرے، جیسے پی آئی اے، واپڈا، اسٹیل ملز وغیرہ۔

"سقف الإعتماد" مقرر کرنے میں کئی عوامل کا دخل ہوتا ہے، مثلاً کبھی کسی خاص شعبے مثلاً زراعت یا صنعت وغیرہ میں زیادہ تمویل مطلوب ہوتی ہے تو بینکوں کا رُخ ادھر کردیا جاتا ہے، کبھی اِفراطِ زر کو کنٹرول کرنے کے لئے حد مقرر کی جاتی ہے، اس لئے کہ بینکوں کے زیادہ قرضے جاری کرنے سے بھی اِفراطِ زر میں اِضافہ ہوتا ہے، جیسا کہ آگے "تخلیقِ زر" کے عنوان کے تحت اس کی وضاحت ہوگی۔ اور کبھی مروّجہ ٹیکسوں سے حکومت کے اِخراجات پورے نہیں ہورہے ہوتے اور مزید ٹیکس لگانا مشکل ہوتا ہے تو مرکزی بینک کا "Reserve" بڑھا کر اور بینکوں کو سرکاری تمسکات خریدنے کا پابند کرکے عوام کی رُقوم کا ایک بڑا حصہ حکومت قرض لے لیتی ہے۔

"سقف الإعتماد" کے اندر رہتے ہوئے بینکوں کے قرض دینے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے بینک یہ جائزہ لیتا ہے کہ جو شخص قرض لینا چاہتا ہے، وہ

مدّتِ مقرّرہ پر قرض واپس بھی کردے گا یا نہیں؟ اس کی جائیدادیں اور مملوکات کیا ہیں؟ جائزہ لینے کے بعد بینک ایک حد مقرّر کردیتا ہے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا قرض دینے کے لئے تیار ہیں، جو حسب ضرورت وقتاً فوقتاً لیا جاسکے گا۔ قرض کی حد مقرّر کرنے کو عربی میں "تحدید السقف" اور انگریزی میں "Sanction of The Limit" کہتے ہیں۔ اس تحدید کے بعد اس شخص کے لئے بینک میں اکاؤنٹ کھول دیا جاتا ہے، اس اکاؤنٹ سے جب چاہے اور جتنا چاہے قرض لے سکتا ہے، اس اکاؤنٹ کھولنے پر بہت خفیف شرح سے بینک سود بھی لیتا ہے (مثلاً ۵٪، یا ۱٪) اور جب وہ قرض لے لیتا ہے تو اَب باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے، اس مدّت کے دوران عموماً یوں ہوتا ہے کہ ایک رقم بینک سے لے کر اس میں سے جو بچ جائے وہ دوبارہ بینک میں واپس کردی جاتی ہے، اس طرح رقم لینے اور واپس کرنے کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، مدّت کے اِختتام پر بینک حساب کرتا ہے کہ کتنی رقم کتنے دن اس کے پاس رہی، اس حساب کے مطابق اس سے سود لیا جاتا ہے۔

بینک کی اَقسام (باعتبارِ تمویل)

بینک کی کئی قسمیں ہیں، بعض بینک خاص شعبوں میں تمویل کرتے ہیں اور بعض عمومی تمویل کرتے ہیں، اس طرح بینکوں کی اقسام یہ ہیں:-

۱- زرعی بینک:- جس کو عربی میں "المصرف الزراعی" اور انگریزی میں "Agricultural Bank" کہتے ہیں، یہ بینک زراعت کے شعبے میں قرض فراہم کرتا ہے۔

۲- صنعتی بینک:- جس کو عربی میں "المصرف الصناعی" اور انگریزی میں "Industrial Bank" کہتے ہیں، اس کا کام صنعتی ترقی کے لئے قرضے فراہم کرنا ہے۔

۳- ترقیاتی بینک:- جو بینک کسی بھی شعبے میں ترقیاتی کاموں کے لئے قرضے دیتے ہیں ان کو "ترقیاتی بینک" کہتے ہیں، جن کو عربی میں "بنوک التنمیة" اور انگریزی میں "Development Banks" کہتے ہیں۔

۴- کوآپریٹو بینک (Co-operative Bank):- اس کو عربی میں "المصرف التعاونی" کہہ سکتے ہیں، یہ بینک اِمدادِ باہمی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، اس کا دائرۂ کار ممبران تک محدود ہوتا ہے، جو لوگ اس کے ممبر ہوتے ہیں انہی کے پاس ڈپازٹ ہوتے ہیں اور انہی کو قرض دیا جاتا ہے۔

۵- انوسٹمنٹ بینک (Investment Bank):- عربی میں "بنک الإستثمار" کہتے ہیں۔ بظاہر مختلف ممالک میں یہ اِصطلاح مختلف مفہوم کے لئے استعمال ہوتی رہی ہے۔ ہمارے ہاں اس سے مراد ایسا بینک ہوتا ہے جس میں ڈپازٹ متعینہ مدّت کے لئے ہوتے ہیں، عام کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ اس میں نہیں ہوتے، صرف فکسڈ ڈپازٹ ہوتے ہیں، اور قرضے بھی محدود مدّت کے لئے جاری کئے جاتے ہیں، اس سے کم مدّت کے لئے قرضے نہیں دیئے جاتے۔

ان تمام بینکوں کا دائرۂ کار محدود ہوتا ہے۔

۶- کمرشل بینک:- ایسے بینک جو عمومی تمویل کا کام کرتے ہیں، کسی شعبے کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتے ان کو "کمرشل بینک" (Commercial Bank) اور عربی میں "البنک التجاری" کہتے ہیں۔

درآمد، برآمد میں بینک کا کردار

بینک کے وظائف میں یہ بھی داخل ہے کہ بینک بین الاقوامی تجارت (درآمد و برآمد) میں ایک لازمی ذریعہ ہے، بینک کی وکالت اور معرفت کے بغیر برآمد اور درآمد ممکن نہیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب کوئی شخص دُوسرے ملک سے کوئی چیز درآمد کرنا چاہتا ہے تو دُوسرے ملک کا تاجر اس بات کا اطمینان چاہتا ہے کہ جب میں مطلوبہ سامان خریدار کو بھیجوں گا تو وہ واقعتاً قیمت کی ادائیگی کردے گا۔ لہٰذا درآمدکنندہ برآمدکنندہ کو اِعتماد دِلانے کے لئے بینک سے ایک ضمانت نامہ حاصل کرتا ہے، جس میں بینک بیچنے والے کو اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ یہ چیز فلاں شخص کو فروخت

کردی جائے تو ادائیگی کا ذمہ دار میں ہوں گا۔ اس کو عربی میں "خطاب الضمان" یا "خطاب الإعتماد" کہتے ہیں، اور انگریزی میں "Letter of Credit" کہتے ہیں۔ آسانی کے لئے "ایل-سی" (L/C) کہہ دیا جاتا ہے۔ یہ ضمانت نامہ حاصل کرنے کو اُردو میں "ایل-سی کھلوانا" اور عربی میں "فتح الإعتماد" کہتے ہیں۔ بینک ایل-سی کھول کر برآمدکنندہ کے بینک کو بھیج دیتا ہے، برآمدکنندہ کے بینک کو "Negotiating Bank" کہتے ہیں۔ ایل-سی پہنچنے کے بعد وہاں سے مال جہاز میں بک کرادیا جاتا ہے، اور جہازراں کمپنی مال بک ہونے کی رسید جاری کرتی ہے، اس رسید کو عربی میں "بولیصة الشحن" اور انگریزی میں "Bill of Lading" کہتے ہیں۔ برآمدکنندہ بینک یہ بل آف لیڈنگ بمعہ متعلقہ کاغذات کے ایل-سی کھولنے والے بینک کو بھیجتا ہے، درآمدکنندہ اپنے بینک سے یہ کاغذ وصول کرکے ایل-سی سے اس کی مطابقت کرتا ہے، ان کاغذات میں مال کی جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ آرڈر کے خلاف ہو تو کاغذات واپس کردیئے جاتے ہیں، اگر کاغذات کی تفصیل ایل-سی کے موافق ہو تو یہ کاغذات دکھا کر بندرگاہ سے مال وصول کیا جاتا ہے۔ اور بینک عموماً یہ کاغذات درآمدکنندہ کو اس وقت دیتا ہے جب وہ قیمت کی ادائیگی کردے ــــــــ ادائیگی کے لئے بھی بینک اور درآمدکنندہ کے درمیان مختلف معاہدے ہوتے ہیں۔ کبھی درآمدکنندہ ایل-سی کھلواتے وقت ہی پوری رقم کی ادائیگی کردیتا ہے، اس صورت کو اِصطلاح میں یہ کہا جاتا ہے کہ فل مارجن (Full Margin) پر ایل-سی کھلوائی گئی ہے، عربی میں اس کو "فتح الإعتماد بغطاء كامل" کہتے ہیں۔ کبھی ساری ادائیگی بینک سے کاغذات چھڑوانے کے وقت ہوتی ہے، اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ "زیرو مارجن" پر ایل-سی کھلوائی گئی۔ کبھی ایل-سی کھولنے کے وقت تھوڑی ادائیگی کی جاتی ہے، اس صورت میں کل رقم کا جتنا فیصد ادا کیا گیا اتنے ہی فیصد مارجن پر ایل-سی کھولنا کہتے ہیں۔ مثلاً کل قیمت کا پچیس فیصد حصہ ایل-سی کھلواتے وقت بینک میں جمع کرادیا گیا تو کہا جائے گا کہ یہ ایل-سی پچیس فیصد مارجن پر کھلوائی گئی ہے۔

کبھی یہ معاہدہ بھی ہوتا ہے کہ کاغذات آنے پر بینک اپنے پاس سے ادائیگی

کردے گا اور درآمدکنندہ ایک معین مدت کے بعد ادائیگی کرے گا، اس صورت میں بینک کا قرض درآمدکنندہ کے ذمے ہوجاتا ہے جس پر عموماً وہ سود لیتا ہے۔

ایل-سی پر فیس

بینک کو ایل-سی کھولنے میں جو خدمات ادا کرنی پڑتی ہیں، ان پر بینک معاوضہ لیتا ہے، درآمدکنندہ کے بینک کی تین خدمات ہوتی ہیں:-

۱- وکالت (Agency) یعنی بینک درآمدکنندہ کا وکیل بن کر برآمدکنندہ سے معاملات کرتا ہے، خریدار کے کاغذات برآمدکنندہ کو بھیجتا ہے، اور برآمدکنندہ کے بھیجے ہوئے کاغذات وغیرہ درآمدکنندہ کو سپرد کرتا ہے، ان خدمات پر بینک اُجرت لیتا ہے۔

۲- ضمانت (Guarantee) یعنی اس بات کی ضمانت لیتا ہے کہ اگر خریدار نے رقم ادا نہ کی تو وہ رقم ادا کرے گا، اس پر بھی اُجرت لیتا ہے۔

۳-قرض (Credit) یعنی جب تاجر قیمت کی ادائیگی فوراً نہ کرے، اور بینک اس کی طرف سے ادائیگی کردے تو یہ رقم درآمدکنندہ کے ذمے اس کا قرض ہوجاتی ہے، جس پر وہ درآمدکنندہ سے سود وصول کرتا ہے۔

قرضہ دو نوعیت کا ہوسکتا ہے، کبھی تو باقاعدہ قرضہ لیا جاتا ہے جبکہ یہ معاہدہ ہو کہ بروقت ادائیگی بینک کرے گا اور درآمدکنندہ اس کے کچھ عرصہ بعد بینک کو ادائیگی کرے گا۔ یہ ایک الگ معاہدہ ہوتا ہے، ایل-سی کی فیس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس پر الگ سے باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے۔ کبھی باقاعدہ تو قرض نہیں لیا جاتا، لیکن خودبخود معاملات کے درمیان بینک کا ایل-سی کھلوانے والے کے ذمے قرض ہوجاتا ہے، یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کبھی ایل-سی کھلواتے وقت پوری ادائیگی ہوجاتی ہے، اس کو ۱۰۰ فیصد شرح (Margin) پر ایل-سی کھلوانا کہتے ہیں، کبھی کچھ ادائیگی ہوتی ہے، مثلاً ۲۵ فیصد کی ادائیگی پر ایل-سی کھولی گئی اس کو ۲۵ فیصد شرح (Margin) پر ایل-سی کھلوانا کہیں گے۔ کبھی ایل-سی کھلوانے کے وقت بالکل ادائیگی نہیں ہوتی، اس کو زیرو مارجن پر ایل-سی کھولنا کہتے ہیں۔ اب اس صورت میں جبکہ

ادائیگی کے بغیر یا کچھ ادائیگی پر ایل-سی کھولی گئی ہو کاغذات آتے ہی بینک ادائیگی کردے گا، بشرطیکہ سامان کے کاغذات ایل-سی کی شرائط کے مطابق ہوں اور کوئی عدمِ مخالفت نہ پائی گئی ہو، مگر درآمد کنندہ کی طرف سے کسی وجہ سے ادائیگی میں چند دن تاخیر ہوجاتی ہے، مثلاً اس لئے تاخیر ہوگئی کہ بینک کی طرف سے رابطہ کرنے میں تاخیر ہوگئی، ایسی صورت میں اتنے دن کا قرضہ خودبخود ہوجاتا ہے، اس قرضے پر بھی سود لیا جاتا ہے۔

دُوسری طرف برآمد کنندہ کا بینک ضمانت کسی چیز کی نہیں دیتا، یہاں بینک کے دو ہی کام ہوتے ہیں، جن پر بینک معاوضہ لیتا ہے:-

۱- وکالت ۲-قرض

یہاں قرض اس طرح ہوتا ہے کہ ایل-سی میں کبھی تو معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات آتے ہی ادائیگی ضروری ہوگی، اس کو "L.C at Sight" کہتے ہیں، اس صورت میں برآمد کنندہ کے بینک کو کوئی قرض نہیں دینا پڑتا۔ کبھی معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات پہنچنے کے اتنے دن بعد خریدار کی طرف سے ادائیگی ہوگی، تو ایسی صورت میں اگر برآمد کنندہ کا بینک برآمد کنندہ تاجر کو فوراً ادائیگی کردے تو یہ بینک کا برآمد کنندہ کے ذمے قرض ہوجائے گا۔

درآمد کنندہ کے پاس کبھی درآمد کے لئے رقم نہیں ہوتی یا رقم تو ہوتی ہے، مگر وہ اس رقم کو درآمد پر لگا کر منجمد نہیں کرنا چاہتا، تو وہ بینک سے قرض لے کر درآمد کرتا ہے، درآمد کے لئے بینک جو قرض دیتا ہے اس کو عربی میں "تمویل الواردات" اور انگریزی میں "Impert Financing" کہتے ہیں۔ ایسے ہی برآمد کے لئے بھی بینک سے قرض لیا جاتا ہے، یعنی کسی تاجر کے پاس باہر کے کسی ملک سے اشیاء کی خریداری کا آرڈر ہوتا ہے، لیکن وہ اشیاء تیار یا مہیا کرنے کے لئے اسے رقم کی ضرورت ہوتی ہے، جو وہ بینک سے قرض لیتا ہے اور قرض لے کر مطلوبہ اشیاء فراہم کرکے برآمد کرتا ہے، اس صورت میں بینک برآمد کنندہ کو جو قرض دیتا ہے اس کو "تمویل الصادرات" اور انگریزی میں "ExportFinancing" کہتے ہیں۔

ہر حکومت برآمدات کی حوصلہ افزائی کرتی ہے تاکہ ملک کا سامان باہر فروخت ہو تو اس سے زرِ مبادلہ ملک میں آئے۔ پاکستان میں بھی برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے ''اسٹیٹ بینک آف پاکستان'' نے ایک اسکیم جاری کی ہے، جس کو "Export Refinancing" (اعادة تمويل الصادرات) کہتے ہیں۔ اس کا طریقِ کار پہلے یہ تھا کہ مرکزی بینک نے ملک کے کمرشل بینکوں کو یہ ہدایت جاری کی تھی کہ برآمدات کے لئے دیئے جانے والے قرضوں پر سود کم شرح سے وصول کیا کریں، مثلاً عام شرحِ سود ۱۵ فیصد ہوتی ہے تو برآمداتی قرضوں پر آٹھ فیصد سود لیا کریں۔ اس طرح جو کمرشل بینک قرض دے گا، مرکزی بینک اتنی ہی رقم اس بینک کو دے گا، اور آٹھ فیصد سود میں سے پانچ فیصد مرکزی بینک لے گا اور تین فیصد سود کمرشل بینک کا ہوگا، اس صورت میں بینکوں کو یہ فائدہ ہوتا تھا کہ انہیں اپنی رقم لگائے بغیر تین فیصد سود مل جاتا تھا. کیونکہ قرض کی رقم مرکزی بینک نے مہیا کی تھی۔

اب اس کے طریقِ کار میں یہ تبدیلی ہوگئی ہے کہ مرکزی بینک کمرشل بینک کو اتنی رقم دینے کی بجائے اس بینک کے نام اتنی رقم کا ڈپازٹ اکاؤنٹ کھول دیتا ہے اور اس پر ٹریژری بل[1] کے حساب سے اس کمرشل بینک کو سود دیتا ہے، جو عموماً چودہ یا پندرہ فیصد ہوتا ہے، اور کمرشل بینک کو جو آٹھ فیصد سود قرضہ لینے والے کی طرف سے ملے گا اس میں سے پانچ فیصد مرکزی بینک کو دے گا، اس صورت میں کمرشل بینک کو تین فیصد سود اس میں سے بچے گا اور چودہ یا پندرہ فیصد سود مرکزی بینک کی طرف سے ملے گا، اس کا مقصد برآمدات میں تمویل کی حوصلہ افزائی ہے۔

بل آف ایکسچینج

بل آف ایکسچینج ایک خاص قسم کی دستاویز ہے، جب کوئی تاجر اپنا مال فروخت کرتا ہے تو خریدار کے نام بل بناتا ہے، بعض اوقات اس بل کی ادائیگی کسی آئندہ

(۱) اس کی وضاحت مرکزی بینک کے وظائف کے بیان میں ہوگی، اس پر نیلام کے ذریعے سود طے ہوتا ہے۔

تاریخ میں واجب ہوتی ہے، اس بل کو دستاویزی شکل دینے کے لئے مدیون اس کو منظور کر کے اس پر دستخط کر دیتا ہے کہ میرے ذمے فلاں تاریخ کو اس بل کی ادائیگی واجب ہے، اس کو عربی میں "کمبیالة"، اُردو میں ''ہنڈی'' اور انگریزی میں "Bill of Exchange" کہتے ہیں۔ بل آف ایکسچینج میں ادائیگی کی جو تاریخ لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس تاریخ کے آجانے کو عربی میں "نضج الكمبيالة" اور انگریزی میں "Maturity" کہتے ہیں، اس تاریخِ ادائیگی کو "Maturity Date" کہتے ہیں۔ ہنڈی میں لکھا ہوا دَین تو مدیون سے تاریخِ ادائیگی آنے پر ہی لیا جاسکتا ہے، مگر دائن کو فوری طور پر رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی تیسرے شخص کو وہ بل دے کر لکھی ہوئی رقم لے لیتا ہے اور بل کی پشت پر دستخط کر کے اس کے حقوق اس تیسرے شخص کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ تیسرا شخص اس پر لکھی ہوئی رقم میں کٹوتی بھی کرتا ہے، مثلاً ہنڈی پر ایک ہزار روپے لکھے ہوئے ہیں تو وہ نوسو پچاس (۹۵۰) روپے دیتا ہے، اس عمل کو عربی میں "خصم الكمبيالة" اور انگریزی میں "Discounting of the Bill of Exchange" اور اُردو میں ''بٹہ لگانا'' کہتے ہیں۔ اور ہنڈی کی پشت پر جو دستخط کئے جاتے ہیں اس کو عربی میں ''تظهير'' اور انگریزی میں "Endorsement" کہتے ہیں، اور اُردو میں ''عبارت ظہری لکھنا'' کہتے ہیں۔ ہنڈی پر بٹہ لگانے کی شرح "Maturity" (نضج الكمبيالة) کو مدِنظر رکھ کر طے ہوتی ہے، تاریخِ ادائیگی جتنی قریب ہوتی ہے بٹہ لگانے کی شرح کم ہوتی جاتی ہے۔

بینک بھی عموماً بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کرتے ہیں اور یہ بھی بینکوں کے قصیر المیعاد قرضوں میں داخل ہے، اس لئے کہ بل آف ایکسچینج کی ادائیگی "Maturity" عموماً تین ماہ میں ہوتی ہے۔

تخلیقِ زَر کا عمل

بینک کا ایک اہم کردار جس کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بینک پہلے سے موجود زَر میں اضافہ کر کے زَر کے پھیلاؤ کو بڑھاتا ہے اور زَر کی رسد میں

اضافے کا کام انجام دیتا ہے، اس کو "تخلیقِ زر" یا "تخلیقِ اعتبار" کہتے ہیں، ذیل میں اس کی وضاحت کی جاتی ہے۔

لوگوں کے پاس جو رقم آتی ہے اس میں سے بہت تھوڑا سا حصہ لوگ اپنے پاس رکھتے ہیں، اس کا زیادہ حصہ بینک میں رکھتے ہیں، اسی طرح جب لوگ بینک سے قرض لیتے ہیں تو نقد کی شکل میں لینا ضروری نہیں سمجھتے ہیں، بلکہ قرض دینے کی عموماً صورت یہ ہوتی ہے کہ بینک قرض لینے والے کا اکاؤنٹ کھول کر اس کو چیک بک دے دیتا ہے، تاکہ بوقتِ ضرورت چیک جاری کرکے بذریعہ چیک ادائیگی کر سکے، مثلاً کسی نے بینک سے ایک لاکھ روپے کا قرضہ لیا تو بینک اس کو نقد ایک لاکھ روپے دینے کی بجائے ایک لاکھ روپے کا اس کے نام اکاؤنٹ کھول کر چیک بک اس کو دے دیتا ہے، اب اس کو جب بھی کہیں کسی رقم کی ادائیگی کرنا ہوگی تو وہ چیک جاری کرکے ادائیگی کرے گا۔ ان دو باتوں کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ بینک کے پاس جتنے نوٹ موجود ہوتے ہیں اس سے کئی گنا زیادہ کا فائدہ اُٹھایا جارہا ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ جب کسی بینک کے پاس کچھ نوٹ آئے تو بینک مرکزی بینک کا ریزرو نکال کر باقی رقم لوگوں کو قرض دیدے گا، جس نے قرض لیا وہ یا تو نقد لے گا ہی نہیں، بلکہ اکاؤنٹ کھلوا کر چیک بک لے گا، یا لے کر دوبارہ اسی بینک میں رکھوائے گا، اس سے جتنی رقم کا مزید اکاؤنٹ کھولا گیا زر میں اتنا اضافہ ہوا، حالانکہ نوٹ اتنے ہی ہیں جتنے رکھے گئے تھے، پھر قرض دار کا اکاؤنٹ کھولنے سے جو نیا ڈپازٹ بینک کے پاس آیا ہے اس میں سے بھی ریزرو نکال کر باقی رقم بینک آگے قرض دیدے گا، جو شخص قرض لے گا وہ پھر بینک میں رکھوائے گا تو اس سے زر میں مزید اضافہ ہوگا، اسی طرح زر میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا، اس کو "تخلیقِ زر" کہتے ہیں۔

مثلاً کسی بینک میں کسی شخص نے ۱۰۰ روپے رکھے، بینک نے اس میں سے بیس فیصد یعنی بیس روپے مرکزی بینک کو دے کر باقی اسّی روپے کسی کو قرض دے دیئے، اس نے یہ اسّی روپے پھر اسی بینک میں رکھ دیئے، تو اب بینک کے پاس کل

ایک سو اَسّی روپے کے ڈپازٹ ہوگئے، اس کا بیس فیصد یعنی چھتیس روپے (جس میں سے بیس روپے پہلے دے چکا ہے، اس لئے مزید سولہ روپے) مرکزی بینک کو دے کر باقی ۶۴ روپے پھر کسی کو قرض دے گا، اور وہ بھی اس بینک میں رکھوائے گا تو بینک کے ڈپازٹ میں ۶۴ روپے کا اضافہ ہوجائے گا اور بینک کے پاس ۲۴۴ روپے کے ڈپازٹ ہوجائیں گے۔ اس رقم کا بیس فیصد یعنی ۴۸٫۸۰ روپے (جس میں سے چھتیس روپے پہلے دے چکا ہے، مزید ۱۲٫۸۰ روپے) مرکزی بینک کو دے کر باقی ۵۱٫۲۰ روپے کا پھر قرض دے گا، اور وہ شخص دوبارہ اسی بینک میں رکھ دے گا، اس طرح بینک کے پاس ۲۹۵٫۲۰ روپے کے ڈپازٹ ہوگئے، اس طرح بینک مزید قرض دیتا رہتا ہے یہاں تک کہ رقم ختم ہوجاتی ہے۔ اس مثال میں بینک کے پاس سو روپے تھے، مگر اس سے فائدہ ۲۹۵ روپے کا حاصل کیا جارہا ہے، ہر ڈپازٹ ہولڈر اپنے اپنے ڈپازٹ کی بنیاد پر چیک جاری کرسکتا ہے، تو گویا ۲۹۵ روپے کے چیک جاری ہوسکتے ہیں، جبکہ اصل میں سو روپے تھے، مزید ۱۹۵ روپے بینک کے تخلیق کردہ ہیں، اور بینک کا یہ عمل "تخلیقِ زر" ہے۔ اس مثال میں ایک بینک فرض کرکے یہ کہا گیا ہے کہ قرض لینے والا اسی بینک میں دوبارہ رقم رکھوائے گا، لیکن عملاً یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اس بینک کے بجائے کسی اور بینک میں رقم رکھوادے، اس کے نتیجے میں اس دُوسرے بینک کے ڈپازٹ بڑھ جائیں گے۔ بہرکیف! بینک سے لئے جانے والے ہر قرض کے نتیجے میں کسی نہ کسی بینک کے ڈپازٹ میں اضافہ ہوگا، تو اس صورت میں تمام بینکوں کا مجموعہ "تخلیقِ زر" کا عمل کرے گا۔

بینک کے زَر کو بڑھانے میں ایک اور چیز کا بہت زیادہ دخل ہے، جس کو اصطلاح میں "فلوٹ" (Float) کہتے ہیں۔ بینک کے پاس جو رقم ڈپازٹ کے طور پر ہے، اس پر بینک کو سود دینا پڑتا ہے، یہ سود ان ڈپازٹس کی لاگت (Cost) ہے، یعنی یہ سود دے کر بینک کو یہ ڈپازٹ حاصل ہوئے، لیکن کبھی رقم کچھ مدت کے لئے رہتی تو بینک کے پاس ہی ہے، مگر اس مدت میں وہ بینک کے ڈپازٹ میں شامل نہیں ہوتی

اور اس پر بینک کو سود نہیں ادا کرنا پڑتا، یہ بینک کا ایک ایسا زر ہے جس پر لاگت کچھ بھی نہیں ادا کرنی پڑتی۔ ایسا کئی صورتوں میں ہوتا ہے، مثلاً بینک کی طرف سے دُوسرے بینک کی طرف چیک جاری کیا گیا تو اس بینک سے دُوسرے بینک کی طرف رقم منتقل ہونے میں کچھ مدّت لگ جاتی ہے، اس دوران یہ رقم بینک کا فلوٹ ہے۔ اسی کی ایک صورت یہ ہے کہ بینک نے کسی کو ڈرافٹ دے دیا، جب تک وہ ڈرافٹ کیش نہیں کرالیا جاتا اس وقت تک یہ رقم بینک کے پاس فلوٹ کے طور پر ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ بینک ایل-سی کھولتا ہے اور ایل-سی کھلوانے والا ادائیگی اسی وقت کردیتا ہے، مگر بینک آگے ادائیگی اس وقت کرتا ہے جبکہ کاغذات آجاتے ہیں، اتنی دیر کے لئے بغیر کسی لاگت کے وہ رقم بینک کے پاس رہتی ہے، اسی طرح ریلوے بلٹی میں ہوتا ہے کہ کاغذات بینک میں آتے ہیں، بینک میں ادائیگی کرکے کاغذات وصول ہوتے ہیں اور کاغذات وصول کرکے بلٹی چھڑائی جاتی ہے، اب کاغذات بینک سے لیتے ہوئے ادائیگی تو بینک میں کردی جاتی ہے، مگر بلٹی بھیجنے والے کو یہ رقم ملنے میں تاخیر ہوجاتی ہے، یہ بھی بینک کا فلوٹ ہے۔ حج درخواستوں کا معاملہ بھی ایسے ہی ہے، اس کے علاوہ فلوٹ کی اور بھی صورتیں ہوسکتی ہیں، فلوٹ کے ذریعے بینکوں کو کافی سرمایہ حاصل ہوتا ہے۔

اس سے ایک اور بات سامنے آگئی، وہ یہ کہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بینک ڈپازیٹر (رقم رکھوانے والوں) کو جو سود دیتا ہے، بینک کی لاگت بھی اتنی ہی ہوتی ہوگی، مثلاً ۸ فیصد سود دیتا ہے تو بینک کی لاگت بھی آٹھ فیصد ہوگی، مگر واقعے میں معاملہ ایسا نہیں، بینک کی حقیقی لاگت اس سے کم ہوتی ہے جو اس نے سود دیا ہے، اس لئے کہ بینک کے پاس بہت سی رقم ایسی بھی ہوتی ہے جس پر وہ سود ادا نہیں کرتا اور اس سے نفع حاصل کرتا ہے، ایسی رقم ایک تو فلوٹ کی رقم ہے، دُوسری کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم ہوتی ہے ـــــــ اس سے معلوم ہوا کہ بینک کو جو نفع حاصل ہوتا ہے اس کا آٹھ فیصد سے بھی کم حصہ عوام کو ملتا ہے، لہٰذا بینک کے نفع کا رُخ عوام کی طرف کم ہے اور سرمایہ داروں کی طرف زیادہ ہے۔

مرکزی بینک

"البنک الرئیسی" (Central Bank)

یہ ملک کا انتہائی اہم ادارہ ہوتا ہے، جو تمام تجارتی بینکوں (Commercial Banks) کا نگران ہوتا ہے، ملک کے مالیاتی نظام میں اس کا بہت اہم کردار ہوتا ہے، جیسا کہ اس کے وظائف کی تفصیل سے معلوم ہوگا۔ اس ادارے کو اُردو میں ''مرکزی بینک''، عربی میں "البنک الرئیسی" یا "المصرف الرئیسی" اور انگریزی میں "Central Bank" کہتے ہیں۔ مرکزی بینک مختلف ممالک میں مختلف ناموں سے موسوم ہوتا ہے، مثلاً پاکستان میں ''اسٹیٹ بینک آف پاکستان'' مرکزی بینک ہے، انگلینڈ میں ''بینک آف انگلینڈ''، انڈیا میں ''ریزرو بینک آف انڈیا'' مرکزی بینک ہے۔

مرکزی بینک کے وظائف (Functions)

مرکزی بینک (Central Bank) متعدّد وظائف انجام دیتا ہے، جن کو یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱- یہ حکومت کا بینک ہوتا ہے، حکومت کی رقمیں اس میں رکھی جاتی ہیں، مگر حکومت کی رقموں پر یہ بینک حکومت کو سود نہیں دیتا ہے، اور بوقتِ ضرورت حکومت کو قرضہ بھی دیتا ہے اور اس سے معمولی شرح پر سود بھی لیتا ہے۔

۲- مرکزی بینک حکومت کا معاشی پالیسیوں میں مشیر بھی ہوتا ہے۔

۳- مرکزی بینک زرِ مبادلہ کو محفوظ رکھتا ہے، اس کو ذخیرہ کرتا ہے اور بوقتِ ضرورت اس کا اجراء بھی کرتا ہے۔

۴- مرکزی بینک کے سب سے اہم کردار دو ہیں، ایک یہ کہ تمام تجارتی بینکوں (Commercial Banks) کی نگرانی کرتا ہے اور ان کا نظم وضبط برقرار رکھتا ہے تاکہ ان سے مالیاتی فوائد حاصل ہوں اور نقصانات کے پہلو کا سدِّ باب ہو۔

اس مقصد کے لئے مرکزی بینک مختلف کام کرتا ہے، مثلاً:-

۱:...... کسی بینک کے قائم ہونے سے پہلے اس کو لائسنس دینا مرکزی بینک کا کام ہے، مرکزی بینک کی طرف سے لائسنس کے بغیر بینک قائم نہیں ہوسکتا، اور لائسنس جاری کرنے سے پہلے مرکزی بینک تمام ضروری باتوں کا جائزہ لیتا ہے۔

۲:...... معاشی نقطۂ نظر سے جہاں رقم لگانے کی ضرورت زیادہ ہو، مرکزی بینک، تجارتی بینکوں کا رُخ اس طرف کر دیتا ہے، مثلاً کسی خاص علاقے میں ترقیاتی کاموں کی ضرورت ہے، یا کسی خاص شعبے (مثلاً زراعت یا تجارت یا صنعت وغیرہ) میں سرمایہ لگانے کی ضرورت ہو تو مرکزی بینک تجارتی بینکوں کو ان علاقوں یا شعبوں میں زیادہ قرضے دینے کا پابند کر دیتا ہے۔

۳:...... جن لوگوں (Depositers) نے بینک میں اپنی رقمیں لگائی ہوئی ہیں ان کی رقموں کے تحفظ کے لئے قواعد وضوابط بناتا ہے، مثلاً رقم کا اتنا حصہ مرکزی بینک میں رکھنا ہوگا اور اتنا حصہ بینک اپنے پاس محفوظ رکھے گا وغیرہ۔

۴:...... اس بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ بینک کی مجموعی حالت مالی طور پر مستحکم ہو اور ان میں اپنے ذمے حقوق کی ادائیگی کی صلاحیت اور اِستعداد رہے۔

۵:...... تجارتی بینکوں کے باہمی لین دین کا تصفیہ بھی مرکزی بینک کرتا ہے، اس مقصد کے لئے مرکزی بینک میں ایک شعبہ ہوتا ہے جس کو عربی میں "غرفة المقاصة" اور انگریزی میں "Clearing House" کہتے ہیں، اُردو میں اس کو "تصفیہ گھر" کہہ سکتے ہیں، تجارتی بینکوں کے درمیان جو لین دین ہوتا ہے، ایک دُوسرے کی طرف چیک یا ڈرافٹ جاری ہوتے ہیں، روزانہ "غرفة المقاصة" میں ان کا حساب کرلیا جاتا ہے۔

۶:...... کمرشل (تجارتی) بینکوں کو بوقتِ ضرورت مرکزی بینک قرضہ بھی دیتا ہے، جب کسی بینک سے رقمیں نکلوانے کے لئے اتنے زیادہ مطالبات آجائیں کہ وہ اپنے سیال اثاثوں سے ان کو پورا نہ کرسکے تو بینکوں کے پاس آخری چارۂ کار یہی ہوتا ہے کہ وہ مرکزی بینک سے قرض لیں، اسی لئے مرکزی بینک کو "آخری چارۂ کار کے طور پر قرض دینے والا" (Lender of the Last Resort) کہتے ہیں۔

۵- مرکزی بینک کی دو اہم ذمہ داریوں میں سے دُوسری ذمہ داری یہ ہے کہ یہ بینک ملک میں زَر کے بہاؤ کو کنٹرول کرتا ہے، اگر ملک میں اِفراطِ زَر زیادہ ہو تو ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جس سے زَر سکڑنا شروع ہو جائے، اور اگر تفریطِ زَر کی صورتِ حال ہو تو ایسے کام کرے جس سے زَر کا پھیلاؤ بڑھے۔ زَر کو پھیلانے یا سکڑنے کے لئے کئی طریقے ہو سکتے ہیں:-

ا:...... مرکزی بینک، تجارتی بینکوں کو جس شرحِ سود پر قرضہ دیتا ہے اس کو "Bank Rate" (بینک ریٹ) اور عربی میں "سعر البنک" کہتے ہیں، اسی کو "Official Rate" اور عربی میں "السعر الرسمی" بھی کہتے ہیں۔ یہ "بینک ریٹ" بھی زَر کے بہاؤ پر اَثرانداز ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ جب مرکزی بینک شرحِ سود (بینک ریٹ) زیادہ کرے گا تو اَب تجارتی بینکوں کو زیادہ سود پر قرضہ ملے گا، لہٰذا وہ خود بھی عوام کو زیادہ سود پر قرضہ دیں گے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ قرضہ کم لیں گے، جب لوگ قرضہ کم لیں گے تو بینک کا تخلیقِ زَر کا عمل کم ہوگا، اور زَر کی گردش بھی کم ہوجائے گی۔ اس کے برعکس مرکزی بینک شرحِ سود کو گھٹائے گا تو تجارتی بینک بھی گھٹادیں گے جس کے نتیجے میں لوگ قرض زیادہ لیں گے اور تخلیقِ زَر کا عمل زیادہ ہوکر زَر کی رسد بڑھ جائے گی۔

ٹریژری بل

۲:...... دُوسرے طریقے کو "Open Market Operation" اور عربی میں "عملیات السوق المفتوحة" کہتے ہیں، اس نظام کو سمجھنے سے پہلے ٹریژری بل کو سمجھنا ضروری ہے، حکومت کو جب رقم کی ضرورت ہوتی ہے تو رقم حاصل کرنے کے لئے حکومت مختلف قرضے کی دستاویزات جاری کرتی ہے، جن کو "سرکاری تمسکات" کہتے ہیں، ان کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ تجارتی بینکوں سے رقم وصول کرنے کے لئے "مرکزی بینک" ایک بل جاری کرتا ہے جس کو انگریزی میں "Treasury Bill" (ٹریژری بل) اور عربی میں "سندات الخزینة" کہتے ہیں، ایک بل کی "قیمة اسمیة"

(لکھی ہوئی قیمت)(Face Value) سو روپے ہوتی ہے۔

یہ بل مقرّرہ مدّت کے لئے جاری ہوتے ہیں، عموماً چھ ماہ کے لئے جاری ہوتے ہیں، یہ بل بذریعہ نیلام بیچے جاتے ہیں اور ان کے ابتدائی خریدار صرف تجارتی بینک ہی ہوتے ہیں، دُوسرے لوگ بھی بینکوں سے خرید لیتے ہیں۔ نیلام کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مرکزی بینک اعلان کردیتا ہے کہ اتنی رقم (مثلاً دس اَرب روپے) کے ٹریژری بل جاری کئے جارہے ہیں، اور بینک اپنی اپنی طلب بتاتے ہیں، ہر بینک بتاتا ہے کہ میں اتنی قیمت پر اتنے بل خریدنا چاہتا ہوں، آج کل اس کا ریٹ عموماً ۱۳ یا ۱۴ فیصد ہے، یعنی سو روپے کا بل عموماً ۸۶ یا ۸۷ روپے میں فروخت ہوتا ہے، جس جس بینک کی بولی قبول ہوتی جاتی ہے اس کو اس کی طلب کے مطابق بل دے کر رقم اس سے وصول کرلی جاتی ہے، اب جس بینک نے یہ بل مثلاً ۸۶ روپے میں خریدا، وہ چھ ماہ کے بعد اس کے پورے سو روپے وصول کرلے گا اور چودہ روپے اس کے سود یا نفع کے ہوں گے۔ اس بل کی مدت آنے سے پہلے اسٹیٹ بینک ہی میں یا بازارِ حصص (Stock Exchange) میں اس بل کی ہنڈی کی طرح ڈسکاؤنٹنگ (بٹہ لگانا) بھی ہوسکتی ہے۔

''اوپن مارکیٹ آپریشن'' کا مطلب یہ ہے کہ زَر کے بہاؤ کو کنٹرول کرنے کے لئے مرکزی بینک تجارتی بینکوں پر کسی قسم کی پابندی لگانے کی بجائے خود ٹریژری بل کی خرید یا فروخت کے لئے کھلے بازار میں آکر زَر کی رسد اور اس کے بہاؤ پر اَثرانداز ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ جب زَر کا پھیلاؤ کم کرنا ہو تو مرکزی بینک ٹریژری بل کم قیمت پر فروخت کرنے کی آمادگی ظاہر کرتا ہے، جس کے نتیجے میں تجارتی بینک اپنا سرمایہ دے کر بل خریدنے لگتے ہیں اور بینکوں کا زَر مرکزی بینک میں واپس آنا شروع ہوجاتا ہے، بینکوں کے پاس سرمایہ کم ہوجاتا ہے اور قرضوں کی فراہمی کم ہوکر تخلیقِ زَر کا عمل بھی کم ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر زَر کا پھیلا بڑھانا ہو تو مرکزی بینک ٹریژری بل زیادہ قیمت پر خریدنے کے لئے کھلے بازار میں آجاتا ہے، لوگ بل بیچ کر مرکزی بینک سے رقم لیتے ہیں تو زَر پھیل جاتا ہے۔

۳:...... مرکزی بینک ریزرو کی شرح کم یا زیادہ کرکے بھی زَر کی رسد پر اَثر انداز ہوتا ہے، وہ اس طرح کہ ریزرو کم ہوگا تو بینکوں کو زیادہ قرضہ فراہم کرنے کا موقع ملتا ہے، اور تخلیقِ زَر کا عمل بڑھتا ہے۔ ریزرو زیادہ ہو تو بینک کم قرضہ فراہم کرتے ہیں جس کے نتیجے میں تخلیقِ زَر کا عمل بھی کم ہوجاتا ہے، اس لئے مرکزی بینک زَر کو پھیلانے کے لئے ریزرو کم کردیتا ہے اور زَر کے پھیلاؤ کو کم کرنے کے لئے ریزرو بڑھادیتا ہے۔

۴:......سود کی شرح کم یا زیادہ کرکے بھی زَر کے بہاؤ کو کنٹرول کیا جاتا ہے، مرکزی بینک تجارتی بینکوں کو شرحِ سود بڑھانے کا پابند کردے گا تو لوگ قرضہ کم لیں گے، اور زَر کا بہاؤ کم ہوگا، اور اگر شرحِ سود گھٹانے کا پابند کرے گا تو لوگ قرضہ زیادہ لیں گے اور زَر کا بہاؤ بڑھے گا۔

۵:......قرضہ جاری کرنے کی حدبندی کرکے یا مختلف شعبوں کے کوٹے مقرّر کرکے بھی زَر کے بہاؤ کو کم کیا جاتا ہے، مثلاً یہ پابندی لگادے کہ بینک اپنی امانتوں کے صرف چالیس فیصد کی حد تک قرضہ دے سکیں گے، یا بینک اپنی امانتوں کا ۲۵ فیصد فلاں شعبے میں قرضہ دیں گے، ان پابندیوں سے بینک کم قرضہ جاری کرسکیں گے اور تخلیقِ زَر میں کمی ہوگی۔

۶:......مرکزی بینک نوٹ چھاپ کر بھی زَر کے بہاؤ پر اثرانداز ہوسکتا ہے۔

۶- مرکزی بینک کے وظائف میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ بینکوں کے لئے قرضہ دینے کا ایسا نظام مقرّر کرتا ہے، جس سے لوگوں کا بھی نقصان نہ ہو اور ملکی معاشی نظام میں یا بینک کی اپنی مالی حالت میں عدمِ استحکام پیدا نہ ہو۔

۷- اب مرکزی بینک کو بینکوں کے علاوہ دُوسرے مالیاتی اِداروں (جن کی وضاحت آگے آرہی ہے) کی نگرانی کا اِختیار بھی دے دیا گیا ہے۔

***

دیگر مالیاتی اِدارے

المؤسسات المالية (غير المصرفية)

(Non-Banking Financial Institutions)

(N.B.F.I)

کچھ اِدارے اتنی بات میں تو بینک کی طرح ہوتے ہیں کہ لوگوں سے رقمیں جمع کر کے ان کے ذریعے تمویل کرتے ہیں، مگر بینک کے دُوسرے وظائف انجام نہیں دیتے۔ مثلاً ان میں بینک کی طرح کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ نہیں ہوتے، صرف فکسڈ ڈپازٹ ہوتے ہیں، یہ اِدارے بینکوں کی طرح بین الاقوامی تجارت میں بھی واسطہ نہیں بنتے، ایسے اِداروں کو عربی میں "المؤسسات المالية (غير المصرفية)" اور انگریزی میں "Non-Banking Financial Institutions" (نان بینکنگ فنانشل انسٹیٹیوشن) کہتے ہیں۔ ایسے مالیاتی اداروں کی کئی قسمیں ہیں، جن کی وضاحت یہاں کی جاتی ہے:-

۱- ترقیاتی تمویلی اِدارے (Development Financial Institution) جس کو "D.F.I" کہتے ہیں۔

یہ وہ اِدارے ہیں جو ملک میں مختلف ترقیاتی منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں، ابتداءً یہ اِدارے بین الاقوامی مالیاتی اِداروں کی طرف سے قائم ہوئے تھے، وہ اِمداد ان اِداروں میں بھیجتے تھے اور یہ اِدارے ترقیاتی منصوبوں میں تمویل کرتے تھے۔ اسٹیٹ بینک بھی بعض مقاصد کے لئے ان کو سرمایہ دیتا ہے، اس قسم کے کئی اِدارے ہمارے ملک میں ہیں، مثلاً "N.D.F.C" (نیشنل ڈیولپمنٹ فنانس کارپوریشن)، "I.D.B.P" (انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف

پاکستان)، (P.I.C.I.C) (پاکستان انڈسٹریل اینڈ کریڈٹ انوسٹمنٹ کارپوریشن)، بینکرز ایکویٹی، پاک سعودیہ، پاک کویت، پاک لیبیا وغیرہ۔

۲- (A.D.B.P) ایگریکلچر ڈیولپمنٹ بینک آف پاکستان، یہ شعبۂ زراعت میں ترقی کے لئے سرمایہ فراہم کرتے ہیں، عالمی اِدارے اور اسٹیٹ بینک ان کو سرمایہ دیتا ہے اور یہ آگے تمویل کرتے ہیں۔

۳- (Co-operative Society) کوآپریٹو سوسائٹی، جن کو عربی میں "جمعية تعاونية" کہتے ہیں، یہ اِدارے اِمدادِ باہمی کے لئے قائم ہوتے ہیں، جو لوگ ان کے ممبر بنتے ہیں، صرف انہی کو قرض دیتے ہیں۔

۴- لیزنگ کمپنی، یہ کمپنیاں اجارے کے طریقے پر سرمایہ فراہم کرتی ہیں، جس کی تفصیل ان شاء اللہ اگلے باب میں آئے گی۔ پہلے لیزنگ کمپنیوں کو عوام سے سرمایہ لینے کی اجازت نہیں تھی، صرف "N.D.L.C" (نیشنل ڈیولپمنٹ لیزنگ کمپنی) کو اجازت تھی، اب تمام لیزنگ کمپنیوں کو عوام سے سرمایہ لینے کی اجازت دے دی گئی ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ایک مہینے سے زیادہ کے انوسٹمنٹ سرٹیفکیٹ جاری کئے جائیں۔

۵- "N.I.T" (این.آئی.ٹی) نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ۔

متعدّد ممالک میں "یونٹ ٹرسٹ" کا تصوّر موجود ہے، وہ یہ کہ ایک فنڈ قائم کیا جاتا ہے، جس میں لوگوں سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے اور پھر اس فنڈ کی رقم سے خود براہِ راست کاروبار کرنے کے بجائے رقم مختلف نفع بخش کاموں میں لگائی جاتی ہے، ان سے مجموعی طور پر جو نفع ہو وہ لوگوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔ این.آئی.ٹی بھی ایک اِدارہ ہے جو اسی قسم کے فنڈ کے انتظامی فرائض انجام دیتا ہے، فنڈ کے یونٹ بنالئے جاتے ہیں، یونٹ بیچ کر لوگوں سے رقم جمع کرکے اس سے سرمایہ کاری کی جاتی ہے، عموماً اس کی سرمایہ کاری شیئرز میں ہوتی ہے، مختلف کمپنیوں کے شیئرز لے کر نفع حاصل کیا جاتا ہے، کسی بھی کمپنی کے شیئرز جاری ہوں تو این.آئی.ٹی کو ترجیحی حق دیا گیا ہے کہ وہ بیس فیصد تک چاہے تو شیئرز لے سکتا ہے۔

۶- "I.C.P" (انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان) یہ اِدارہ کئی کام کرتا ہے،

ایک یہ کہ این آئی ٹی کی طرح ایک فنڈ جاری کرتا ہے، جس کو ''آئی سی پی میوچل فنڈ'' کہتے ہیں، لوگ اس فنڈ میں رقم لگاتے ہیں، این آئی ٹی کی طرح اس رقم سے سرمایہ کاری کرکے نفع تقسیم کیا جاتا ہے۔ این آئی ٹی اور آئی سی پی کے فنڈ میں فرق یہ ہوتا ہے کہ این آئی ٹی کا یونٹ خرید کر جب چاہیں، این آئی ٹی کو ہی دوبارہ بیچا جاسکتا ہے، مگر آئی سی پی کے شیئرز لے کر آئی سی پی کو دوبارہ نہیں بیچے جاسکتے ہیں، البتہ کمپنی کے شیئرز کی طرح کسی اور کو فروخت کیا جاسکتا ہے۔

آئی سی پی کا دُوسرا کام یہ ہے کہ جو لوگ بیرونِ ملک رہتے ہیں وہ آئی سی پی میں اپنی رقم کا اکاؤنٹ کھولتے ہیں۔ ایک وہ اکاؤنٹ جس میں آئی سی پی کو اختیار ہوتا ہے کہ جو شیئرز چاہے خرید کر سرمایہ کاری کرے۔ دُوسرا وہ اکاؤنٹ جس میں آئی سی پی کو یہ اختیار نہیں ہوتا، بلکہ جس کا اکاؤنٹ ہے وہ خود بتاتا ہے کہ فلاں کمپنی کے شیئرز لئے جائیں۔

آئی سی پی کا تیسرا کام یہ ہے کہ کسی کو زیادہ قرضے کی ضرورت ہو تو یہ اِدارہ کئی بینکوں کو ملا کر مجموعی طور پر قرض کا انتظام کرتا ہے۔

سودی بینکاری کا متبادل نظام

گزشتہ اوراق میں بینکنگ کے مروّجہ نظام کی وضاحت کی گئی ہے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ موجودہ نظام کی بنیاد سود ہے۔ اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سود ختم کیا جائے تو بینکنگ کے نظام کو چلانے کا متبادل طریقہ کیا ہو؟ اس سلسلے میں اب تک جو تجاویز سامنے آئی ہیں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

سودی بینکاری کے متبادل نظام پر گفتگو سے پہلے چند بنیادی باتیں ذہن نشین کرنا ضروری ہے:-

۱- سودی بینکاری کا متبادل تلاش کرنے کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہئے کہ مروّجہ بینک جتنے کام جس انداز سے کر رہے ہیں، وہ سارے کام کم و بیش اسی انداز سے انجام دیئے جاتے رہیں، اور ان کے مقاصد میں کوئی فرق واقع نہ ہو، کیونکہ اگر سب کچھ وہی کرنا ہے جو اَب تک ہوتا رہا ہے تو ''متبادل طریقِ کار'' کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بلکہ ''متبادل'' کا مطلب یہ ہے کہ بینک کے جو کام موجودہ تجارتی حالات میں ضروری یا مفید ہیں، ان کی انجام دہی کے لئے ایسا طریقِ کار اِختیار کیا جائے جو شریعت کے اُصولوں کے دائرے میں ہو، اور جس سے شریعت کے معاشی مقاصد پورے ہوں۔ اور جو کام شرعی اُصولوں کے مطابق ضروری یا مفید نہیں ہیں، اور جنھیں شرعی اُصولوں کے مطابق ڈھالا نہیں جاسکتا، ان سے صَرفِ نظر کی جائے۔

۲- چونکہ سود کی ممانعت کا اثر تقسیمِ دولت کے پورے نظام پر پڑتا ہے، اس لئے یہ توقع کرنا بھی غلط ہوگا کہ سود کے شرعی متبادل کو برسرِکار لانے سے تمام متعلقہ فریقوں کے نفع کا تناسب بھی وہی رہے گا جو اس وقت سودی نظام میں پایا جاتا ہے۔

بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اگر اِسلامی اَحکام کو ٹھیک ٹھیک رُوبہ کار لایا جائے تو اس تناسب میں بڑی بنیادی تبدیلیاں آسکتی ہیں، بلکہ یہ تبدیلیاں ایک مثالی اسلامی معیشت کے لئے ناگزیر طور پر مطلوب ہیں۔

۳- آج کل بینک جو خدمات انجام دیتا ہے، ان میں یہ پہلو مفید بلکہ موجودہ معاشی حالات کے پیشِ نظر ضروری ہے کہ وہ لوگوں کی منتشر اِنفرادی بچتوں کو یکجا کرکے انہیں صنعت وتجارت میں استعمال کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ بچتیں اگر ہر شخص کی اپنی تجوری میں پڑی رہتیں تو ان سے صنعت و تجارت کے فروغ میں کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ فاضل دولت کا ست پڑا رہنا نہ شرعی اِعتبار سے مطلوب ہے، نہ عقلی اور معاشی اِعتبار سے اسے مفید کہا جاسکتا ہے۔

لیکن ان بچتوں کو صنعت و تجارت میں مصروف کرنے کے لئے جو راستہ مروّجہ بینکوں نے اِختیار کیا ہے، وہ قرض کا راستہ ہے، چنانچہ یہ اِدارے سرمایہ داروں کو اس بات کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ دُوسروں کے مالی وسائل کو اپنے منافع کے لئے اس طرح استعمال کریں کہ ان وسائل سے پیدا ہونے والی دولت کا زیادہ حصہ خود ان کے پاس رہے، اور سرمایہ کے اصل مالکوں کو اُبھرنے کا کماحقہٗ موقع نہ مل سکے۔

چنانچہ مروّجہ نظامِ بینکاری میں بینک کی حیثیت محض ایک ایسے اِدارے کی ہے جو روپے کا لین دین کرتا ہے، اسے اس بات سے سروکار نہیں ہے کہ اس روپے سے جو کاروبار ہو رہا ہے، اس کا منافع کتنا ہے؟ اور اس سے کس کو فائدہ اور کس و نقصان پہنچ رہا ہے؟

اسلامی اَحکام کی رُو سے بینک ایسے اِدارے کی حیثیت میں باقی نہیں رہ سکتا جس کا کام صرف روپے کا لین دین ہو، اس کے بجائے اسے ایک ایسا تجارتی ادارہ بنانا پڑے گا جو بہت سے لوگوں کی بچتوں کو اِکٹھا کرکے ان کو براہِ راست کاروبار میں لگائے، اور وہ سارے لوگ جن کی بچتیں اس نے جمع کی ہیں، براہِ راست اس کاروبار میں حصہ دار بنیں، اور ان کا نفع ونقصان اس کاروبار کے نفع ونقصان سے وابستہ ہو جو ان کے سرمائے سے بالآخر انجام دیا جارہا ہے۔ لہٰذا سودی بینکاری کے متبادل جو

اِنتظام تجویز کیا جائے گا، اس پر یہ اِعتراض نہ ہونا چاہئے کہ بینک نے اپنی سابقہ حیثیت ختم کردی ہے، اور وہ بذاتِ خود ایک تجارتی اِدارہ بن گیا ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ ضرورت پوری نہیں ہوسکتی جس کی وجہ سے متبادل نظام کی تلاش کی جارہی ہے۔

۴- چوتھی بات یہ ہے کہ صدیوں سے جمے اور بیٹھے ہوئے کسی نظام کو بدل کر اس کی جگہ ایک نیا نظام جاری کرنے میں ہمیشہ مشکلات ہوتی ہیں، لیکن اگر نظام کی تبدیلی ضروری ہو تو صرف ان مشکلات کی بنا پر نئے نظام کو ناقابلِ عمل قرار دینا کسی طرح دُرست نہیں، ایسے میں ان مشکلات کا حل تلاش کیا جاتا ہے، ان مشکلات کے خوف سے پیش قدمی نہیں روکی جاتی۔

بینکنگ کا شرعی طریقِ کار

اس تمہید کے بعد اب وہ تجاویز پیش کی جاتی ہیں جو بینکنگ کو شرعی اُصول کے مطابق چلانے کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ پہلے یہ سمجھنا چاہئے کہ بینکنگ کا تعلق دوطرفہ ہوتا ہے، ایک طرف اس کا تعلق ان لوگوں سے ہوتا ہے جنھوں نے اپنی رقمیں بینک میں رکھوائی ہیں، دُوسری طرف ان کے ساتھ تعلق ہوتا ہے جن کو بینک تمویل کرتا ہے، یعنی سرمایہ فراہم کرتا ہے، دونوں قسم کے تعلقات پر الگ الگ گفتگو کی جاتی ہے۔

بینک اور ڈپازیٹر کا تعلق

موجودہ نظام میں بینک میں جو رقمیں رکھوائی جاتی ہیں آج کل بینکنگ کی اِصطلاح میں ان کو ''امانت'' کہا جاتا ہے، لیکن فقہی اعتبار سے حقیقت میں وہ قرض ہوتا ہے، اگر بینک کو اِسلامی طریقے سے چلایا جائے تو ''امانت داروں'' کے ساتھ بینک شرکت یا مضاربت کا معاملہ کرے گا۔ اس طریقے میں وہ رقم قرض نہیں ہوگی، بلکہ اب صورتِ حال یہ ہوگی کہ رقم رکھوانے والے ''ربّ المال'' ہوں گے اور بینک مضارب ہوگا، اور لگا ہوا سرمایہ ''رأس المال'' ہوگا، جس پر بینک کسی خاص شرح سے نفع دینے کا پابند نہیں ہوگا۔ بلکہ جو کچھ نفع حاصل ہوگا وہ ایک طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم ہوگا۔

پھر ''کرنٹ اکاؤنٹ'' یا ''الحساب الجاری'' میں بینک آج بھی ڈپازیٹر کو کوئی سود نہیں دیتے، اسلامی طریقِ کار میں بھی اس مد پر کوئی منافع نہیں دیا جائے گا۔ اور کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھی ہوئی رقم ڈپازیٹر کی طرف سے بینک کو دیا ہوا غیر سودی قرض سمجھا جائے گا۔ البتہ دُوسرے نفع بخش کھاتے ''مضاربت'' یا ''شرکت'' کے کھاتوں میں تبدیل ہوجائیں گے۔

البتہ ان کھاتوں کو مضاربت یا شرکت سے بدلنے میں یہ عملی دُشواری معلوم ہوتی ہے کہ شرکت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ تمام کھاتہ داروں کی رقم ایک ساتھ مشترک کھاتے میں آئے، اور ایک ہی وقت پر نفع و نقصان کا حساب کر کے تمام شرکاء میں نفع نقصان تقسیم کیا جائے۔ لیکن بینک میں یہ بات قابلِ عمل نہیں ہوسکتی، کیونکہ یہاں لوگوں کے رقم رکھوانے اور نکالنے کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا ہے، فکسڈ ڈپازٹ میں اگرچہ نکلوانے کی مدّت تو مقرّر ہوتی ہے، لیکن رکھوانے کا وقت مقرّر نہیں، ہر شخص ہر روز فکسڈ ڈپازٹ کا کھاتہ کھول سکتا ہے۔ اور سیونگ اکاؤنٹ میں نہ نکلوانے کی تاریخ مقرّر ہے، نہ رکھوانے کی۔

اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ نظام تبدیل کیا جائے۔ اور لوگوں کو پابند کیا جائے کہ وہ ایک خاص تاریخ میں رقم جمع کرائیں، اور ایک خاص تاریخ ہی میں نکالیں۔ اور شرکت کی مدّت سہ ماہی یا ماہانہ مقرّر کرلی جائے، اور ہر مدّت کے اختتام پر نفع و نقصان کا حساب کر کے اس کی تقسیم عمل میں آئے۔ لیکن اس صورت میں اوّل تو لوگوں کے لئے بینک میں رقم رکھوانے میں مشکلات پیش آئیں گی، ایک ہی تاریخ میں رکھوانے اور ایک ہی تاریخ میں نکلوانے سے بینکوں پر پریشر بھی بڑھے گا، اور اس کے نتیجے میں بہت سی بچتیں کام میں لگنے سے رہ جائیں گی۔

لہٰذا بینکوں کی شرکت و مضاربت میں نفع کی تقسیم کا ایک اور طریقِ کار بعض حلقوں کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے جس کو اکاؤنٹنگ کی اِصطلاح میں ''الحساب الیومی'' یا روزانہ پیداوار پر مبنی حساب (Daily Product Basis) کہا جاتا ہے۔ اس تجویز کا حاصل یہ ہے کہ شرکاء کو یہ آزادی دی جائے کہ وہ جب چاہیں مخصوص قواعد

کے مطابق بینک سے رقمیں نکالتے یا اس میں داخل کرتے رہیں، لیکن جب ایک مدّتِ شرکت ختم ہو تو یہ دیکھا جائے کہ اس مدّت میں کتنی رقم کتنے دن بینک میں رہی، اور فی روپیہ فی یوم منافع کا اوسط کیا رہا، پھر جس شخص کے جتنے روپے اس مدّت کے دوران جتنے دن بینک میں رہے، اس کے حساب سے نفع تقسیم کر دیا جائے۔

شرعی نقطۂ نظر سے اس پر یہ اِشکال ہوسکتا ہے کہ اس طریقے سے نفع کی تقسیم تقریبی ہوتی ہے، اس بات کا اندیشہ ہے کہ کسی کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ دُوسرے کے پاس چلا جائے، مثلاً چھ ماہ کے بعد نفع تقسیم ہوا، ان چھ ماہ میں سے پہلے تین ماہ میں نفع زیادہ ہوا، اور آخری تین ماہ میں نفع کم ہوا۔ ان چھ ماہ کے دوران زید کی رقم تو چھ ماہ بینک میں رہی اور عمرو کی رقم آخری تین ماہ رہی، اور نفع فی یوم برابر ملے گا، تو اس صورت میں زید کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ عمرو کے پاس آجائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ نفع کی تقسیم کی مذکورہ صورت میں یہ اِشکال موجود ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ شرکت میں شرکاء کے اموال مشاع طور پر مخلوط ہوجاتے ہیں، لہٰذا نفع تقسیم کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہر ایک کے سرمائے سے حقیقی نفع کیا ہوا، بلکہ تمام مجموعی سرمائے سے جو مجموعی نفع ہوا ہو وہ تقسیم ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ایک کے سرمائے سے نفع حاصل ہوا ہو اور دُوسرے کے سرمائے سے بالکل نفع نہ ہوا ہو۔ معلوم ہوا کہ نفع کی حقیقی تقسیم شرکت میں مطلوب نہیں، تقریبی تقسیم بھی کافی ہے، بشرطیکہ تمام شرکاء اس پر راضی ہوں، لہٰذا مروجہ طریقے سے نفع کی تقسیم کی شرعاً گنجائش معلوم ہوتی ہے، خصوصاً جبکہ رقم رکھواتے ہوئے ہر شخص کو معلوم بھی ہوتا ہے کہ نفع اس تقریبی طریقے سے تقسیم ہوگا، تو باہمی رضامندی سے تقسیمِ نفع کے ایک حسابی طریقے کو اِختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہ ہونا چاہئے۔

یہ ساری تفصیل اس وقت ہے جبکہ کوئی شخص مدّت کے درمیان میں بینک میں داخل ہوتا ہے یا درمیان میں رقم نکلواتا اور رکھتا رہتا ہے، اگر کوئی شخص درمیانِ مدّت میں بینک سے بالکل ہی نکل رہا ہو تو اس صورت میں یہ مسائل نہیں ہوں گے، اس صورت میں بہتر توجیہ یہ ہوگی کہ اب بینک اس کو نفع تقسیم نہیں کر رہا، بلکہ یہ شخص

کاروبار میں اپنے حصے کو بیچ رہا ہے، اور بینک اس کو خرید رہا ہے، اور حصہ خریدنے کے لئے بینک نے نفع نقصان کی صورت حال کو دیکھ کر اس کے حصے کی قیمت طے کی ہے۔

اسلام کے طریقہ ہائے تمویل

اب تک اسلامی نظام میں بینک اور رقم رکھوانے والے کے تعلق پر گفتگو ہوئی ہے۔ اب بینک کے اہم کام تمویل یعنی سرمایہ فراہم کرنے کے اسلامی طریقوں پر گفتگو کی جاتی ہے، شرعی نقطۂ نظر سے اس کے کئی طریقے ہوسکتے ہیں۔

شرکت و مضاربت

سود کا صحیح اسلامی متبادل شرکت اور مضاربت کا طریقہ ہے، جو سود سے بدرجہا اچھے نتائج کا حامل ہے۔ یہ تمویل کا نہایت مثالی عادلانہ، منصفانہ طریقہ ہے، جس کے تقسیم دولت پر بہت اچھے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے بینکنگ کا یہ تصور بھی ختم ہوسکتا ہے کہ بینک کاروبار کے عمل سے بالکل الگ تھلگ رہتے ہوئے صرف سرمایہ فراہم کرنے کے لئے واسطہ بنتا ہے۔ شرکت اور مضاربت کا نظام جاری ہونے کی صورت میں بینک کا نام خواہ بینک ہی رہے، لیکن بینک کی یہ حیثیت ختم ہوجائے گی، اب بینک کا باقاعدہ کاروبار میں عمل دخل ہوگا۔

شرکت اور مضاربت میں بنیادی فرق یہ ہوتا ہے کہ شرکت میں شرکاء سرمایہ میں بھی حصہ دار ہوتے ہیں اور عمل میں بھی حصہ دار ہوسکتے ہیں، اگر کوئی عملاً کاروبار میں دخل نہ دے، یہ الگ بات ہے۔ اور مضاربت میں ربّ المال کا سرمایہ ہوتا ہے اور مضارب عمل کرتا ہے، ربّ المال کی عمل میں شرکت نہیں ہوتی۔

اب یہاں شرکت اور مضاربت کے چند بنیادی اُصول بیان کئے جاتے ہیں، شرکت اور مضاربت کا معاملہ کرتے ہوئے ان کی رعایت ضروری ہوگی۔

۱- سرمائے کے تناسب سے نفع مقرر کرنا شرعاً جائز نہیں، نفع مقرر کرنے کا صحیح شرعی طریقہ یہ ہے کہ جو نفع حقیقت میں ہوگا اس کا فیصد حصہ مقرر کیا جائے۔

۲- نفع کا جو تناسب بھی چاہیں باہمی رضامندی سے طے کرسکتے ہیں. مثلاً

کسی کا سرمایہ چالیس فیصد ہو اور اس کے لئے ساٹھ فیصد نفع کی شرط لگائی جائے، اور دُوسرے کا سرمایہ ساٹھ فیصد ہو اور اس کے لئے چالیس فیصد نفع کی شرط لگائی جائے، یہ جائز ہے، نفع کی تقسیم بقدرِ سرمایہ ضروری نہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ مختلف شرکاء کے لئے نفع کی مختلف شرحیں طے کی جاسکتی ہیں، جس کو آج کل کی اِصطلاح میں ''وزن'' (Weightage) دینا کہتے ہیں۔ مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جاسکتا ہے، البتہ جس شریک نے کام نہ کرنے کی شرط لگائی ہو، اس کا نفع اس کے سرمائے کے تناسب سے زائد نہیں ہوسکتا۔

۳- نفع میں تو مختلف شرکاء کو مختلف وزن دیا جاسکتا ہے، لیکن نقصان میں اس طرح کرنا جائز نہیں، نقصان بہرحال سرمایہ کے بقدر ہوگا، جس کو فقہاء یوں تعبیر فرماتے ہیں:

"الربح علی ما اصطلحوا علیه، والوضیعة بقدر راس المال"

شرکت و مضاربت میں دُشواریاں

شرکت اور مضاربت کے جاری کرنے میں عموماً دو قسم کی دُشواریاں بتائی جاتی ہیں:-

۱- ایک یہ کہ آج کل دیانت و امانت کا معیار بہت پست ہوگیا ہے، کسی کو شرکت پر سرمایہ دیا جائے تو وہ کبھی بھی حقیقی نفع نہیں بتاتا، بلکہ نفع کی بجائے نقصان دِکھاتا ہے، اس لئے شرکت و مضاربت پر عمل مشکل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی معاشرے میں بددیانتی کی حالت افسوسناک ہے، لیکن بددیانتی کی وجہ سے کبھی کوئی کام بند نہیں ہوتا، مختلف طریقوں سے بددیانتی کا سدِّباب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً آڈٹ کا نظام، اکاؤنٹس کا نظام، سینٹرل بینک کی نگرانی وغیرہ۔ مشارکہ و مضاربہ میں بھی اس جیسی کارروائیاں کی جاسکتی ہیں، نیز جس شخص یا اِدارے کے بارے میں ایک دفعہ بددیانتی ثابت ہوجائے اس کو تمام بینکوں میں ''بلیک لسٹ'' کیا جاسکتا ہے، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایسا شخص آئندہ کسی بینک سے سرمایہ حاصل کرنے سے محروم

ہوجائے گا۔ اگر اس کو قانون بنا کر مؤثر طور پر نافذ کیا جائے تو لوگ بددیانتی کرتے ہوئے ڈریں گے، اور بڑی حد تک اس مفسدے کا سدِّ باب ہوجائے گا۔ اور بھی متعدد قانونی کارروائیاں ہوسکتی ہیں۔ ایک بینک تنہا اگر یہ کام کرے تو واقعی اس کے لئے مشکلات ہیں، لیکن اگر حکومت کی سطح پر یہ کام کیا جائے اور تمام بینکوں کا نظام اس کے مطابق ہو تو بددیانتی کے سدِّ باب کے طریقے ہوسکتے ہیں۔

۲- دُوسری دُشواری انکم ٹیکس کے نظام کی وجہ سے ہے، عموماً تاجر دو قسم کے کھاتے بناتے ہیں، انکم ٹیکس کے لئے الگ کھاتے ہوتے ہیں، اور واقعی کھاتے دُوسرے ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال میں مشارکہ یا مضاربہ پر سرمایہ لینے والا حقیقی نفع دِکھائے تو انکم ٹیکس والے پکڑ لیتے ہیں، اور اگر وہ بینک کو حقیقی نفع نہ دِکھائے تو نفع کی حقیقی تقسیم نہیں ہوتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب حکومتی سطح پر اس مسئلے پر غور کیا جائے تو مشارکہ اور مضاربہ کو کامیاب بنانے کے لئے ٹیکس کے نظام کی اِصلاح بھی ضروری ہوگی، ٹیکس کو آمدنی سے وابستہ کرنے کے بجائے ریاستی ضروریات کے لئے ٹیکس کا کوئی ایسا نظام جاری کیا جاسکتا ہے جس میں بددیانتی کا یہ دروازہ بند ہوجائے۔

پھر تمویل کی بہت سی مدّات ایسی ہیں جہاں شرکت و مضاربت میں بہت لمبے چوڑے حساب و کتاب کی ضرورت نہیں ہوگی، مثلاً برآمدات کی تمویل میں پہلے سے برآمد کئے جانے والے سامان کی لاگت اور حاصل ہونے والی متوقع قیمت کا علم ہوتا ہے، لہٰذا اس میں شرکت یا مضاربت کرنے میں دھوکا فریب کا اِمکان بہت کم ہے۔

اسی طرح یہ ضروری نہیں کہ بینک تاجر کے پورے کاروبار میں شریک ہو، وہ کاروبار کے کسی متعین حصے میں بھی شرکت کرسکتا ہے جس میں نفع کا تعین زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ چونکہ بینک کے لئے تاجروں کا ابدی اور دائمی شریک رہنا ضروری نہیں بلکہ تاجروں اور صنعت کاروں ۔ نے اپنی عمارت، مشینری وغیرہ پہلے ہی سے لگائی ہوئی ہے اور بینک چھ ماہ یا سال بھر کے لئے ان سے شرکت کا معاملہ کرسکتا ہے، اس لئے یہ بات بھی باہمی رضامندی ۔ سے طے ہوسکتی ہے کہ اس مخصوص اور محدود شرکت میں کاروبار کے صرف براہِ راست اِخراجات (Direct Expenses) تسلیم

کئے جائیں گے، اور اجمالی منافع (Gross Profit) فریقین کے درمیان تقسیم ہوگا۔ اور چونکہ جامد اثاثے تاجر نے فراہم کئے ہیں، اس لئے اس کے نفع کا تناسب بڑھایا جاسکتا ہے، لیکن ان جامد اثاثوں کے اخراجات اور بالواسطہ اخراجات شرکت پر نہ ڈالے جائیں۔ اس طرح حساب و کتاب میں بھی آسانی ہوجائے گی اور بددیانتی کا خطرہ بھی کم ہوجائے گا، اور ٹیکس چونکہ صافی منافع پر لگتا ہے اس لئے ٹیکس کے مسئلے کا بھی حل نکل آئے گا۔ شرکت و مضاربت کو کس کس قسم کی تمویل میں استعمال کیا جاسکتا ہے، اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

اصل اسلامی طریقہ تو مشارکہ اور مضاربہ ہی ہے، مگر بعض حالات میں مشارکہ اور مضاربہ ممکن نہیں ہوتا، مثلاً کسی کسان کو ٹریکٹر خریدنے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہو تو اس میں شرکت و مضاربت ممکن نہیں، ایسی صورت میں چند اور بھی تمویل کے طریقے ہیں، جو اب بیان کئے جاتے ہیں۔

اجارہ

یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہے، جس کو "Leasing" کہا جاتا ہے، اور اس کی وضاحت پہلے (کمپنی کے لئے سرمائے کی فراہمی کے عنوان میں) ہوچکی ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ محض اجارے کا لفظ دیکھ کر کسی معاملے کو شرعی نہیں قرار دے دینا چاہئے، اس لئے کہ آج کل عموماً اجارے کے جو معاملات ہوتے ہیں ان میں اجارے کی حقیقت موجود نہیں۔ اجارے کی حقیقت یہ ہے کہ مؤجر (Lessor) جو مشینری وغیرہ اجارے پر دے رہا ہو وہ اس کا مالک اور ذمے دار ہو، مگر تمویلی اجارے میں آج کل عملاً ایسا نہیں ہوتا۔ مؤجر (Lessor) اس مشینری کی کسی قسم کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے، اگر مشینری کا نقصان ہوجائے تو وہ مستأجر (Lessee) کا نقصان سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ کسی حادثے میں مشینری تباہ ہوجائے تو بھی مستأجر کرایہ دیتا رہتا ہے۔ مؤجر کا تعلق اس مشینری سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ عدم ادائیگی کی صورت میں وہ مشینری کو بیچ کر اپنا قرضہ وصول کرلیتا ہے۔ لہٰذا آج کل عموماً حقیقی

اجارہ نہیں ہوتا، اصل مقصد تو سود پر قرض دینا ہی ہوتا ہے، مگر ٹیکس میں بچت کرنے کے لئے اِجارے کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اس طرح کے معاملات شرعاً جائز نہیں۔ تاہم اگر واقعی مؤجر مشینری کا مالک ہو اور وہ اس کی ذمہ داری قبول کر کے اس کا اِجارہ کرے تو اس کی گنجائش ہے۔ اور کرایہ مقرّر کرتے ہوئے اس بات کو مدِنظر رکھا جائے کہ مشینری کی قیمت بمعہ کچھ نفع کے وصول ہوجائے تو اس میں بھی کوئی شرعی قباحت نہیں، مگر معاہدے میں یہ شرط نہ لگائی جائے کہ مدّتِ اِجارہ ختم ہونے پر مشینری خود بخود مستأجر کی ملکیت ہوجائے گی۔ اس لئے کہ اس میں "صفقة فی صفقة" کی شکل بن جاتی ہے، البتہ بغیر سابقہ شرط کے مدّت ختم ہونے کے بعد اس کی طرف ملکیت منتقل کرنے کی گنجائش ہے۔

مرابحہ مؤجلہ

یہ بھی تمویل کا ایک شرعی طریقہ ہوسکتا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص بینک سے قرضہ لینے کے لئے آئے تو بینک اس سے پوچھے کہ کس چیز کو حاصل کرنے کے لئے رقم درکار ہے؟ بینک اس کو رقم دینے کے بجائے وہ چیز خرید کر مرابحۃً نفع پر اُدھار بیچ دیتا ہے، نفع بطور مساومہ کے کوئی بھی قیمت طے کر کے لیا جاسکتا تھا، مگر نفع کی ایک شرح طے کر کے مرابحہ اس لئے کیا جاتا ہے تا کہ نظام میں یکسانیت رہے اور تمام لوگوں سے نفع ایک شرح کے ساتھ وصول ہو، نفع کی جو شرح طے کی جاتی ہے، اس کو مارک اَپ (Mark Up) کہتے ہیں۔

یہ بھی تمویل کا ایک جائز طریقہ ہوسکتا ہے، بشرطیکہ اس کو ٹھیک ٹھیک ضروری شرائط کے ساتھ انجام دیا جائے، اس لئے کہ اُدھار کی وجہ سے قیمت میں اضافہ کرنا باتفاقِ فقہاء جائز ہے۔ اسلامی بینکوں میں اس طریقے پر بڑی وسعت کے ساتھ عمل ہو رہا ہے، لیکن یہ انتہائی نازک طریقہ ہے، اس میں ذرا سی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملادیتی ہے۔ آج کل بینکوں میں مرابحہ کی حقیقت کو سمجھے بغیر اور اس کی ضروری شرائط کی رعایت کئے بغیر اس پر عمل ہو رہا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس میں بہت سی

خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہاں ان غلطیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، جو عموماً مرابحہ کا معاملہ کرتے ہوئے بینکوں سے ہوجاتی ہیں، اور صحیح شرعی طریقے سے مرابحہ کرتے ہوئے ان سے بچنا ضروری ہے۔

مروّجہ مرابحہ میں شرعی خامیاں

۱- مرابحہ کی صحیح شکل تو یہ ہے کہ بینک کوئی چیز خرید کر نفع (Mark Up) پر بیچ دے، مگر پاکستانی بینکوں میں ایسا بھی ہوتا رہا ہے کہ جس چیز پر عقدِ مرابحہ کیا جارہا ہے وہ چیز پہلے سے ہی اس شخص کے پاس موجود ہوتی تھی جو بینک سے قرض لینے کے لئے آیا ہے، بینک اس سے اس چیز کو نقد کم قیمت پر خرید کر پھر نفع پر اسی کو دوبارہ اُدھار بیچ دیتا ہے، اس کو "Buy Back" (بائی بیک) کہتے ہیں۔ اس طرح حقیقتاً مرابحہ کی بجائے نفع (Mark Up) کو "بائی بیک" سے وابستہ کردیا گیا، جو شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز ہے، کیونکہ ایک ہی شخص سے کم قیمت پر خرید کر فوراً ہی اسے زیادہ قیمت پر اُدھار بیچ دینا درحقیقت سودی قرض ہی کی ایک شکل ہے، جبکہ پہلی خریداری میں ہی یہ شرط ہوتی ہے کہ اسے دوبارہ بیچ دیا جائے گا۔

۲- "Buy Back" کا حیلہ بھی حقیقت میں نہیں ہوتا، عموماً محض فرضی کارروائی ہوتی ہے، ایسا کوئی سامان سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا جس پر بائی بیک کیا جارہا ہو۔ حتیٰ کہ اِداروں کے ایسے اِخراجات جن سے کوئی چیز خریدی نہیں جاتی مثلاً تنخواہیں، بلوں کی ادائیگی وغیرہ کے لئے بھی بینکوں سے مرابحۃً قرض مل جاتا ہے۔

۳- اگر "Buy Back" نہ بھی ہو، حقیقت میں مرابحہ ہی ہو تو بھی اس بات کا اہتمام نہیں کیا جاتا کہ جس سامان کو مرابحۃً بیچا جارہا ہے وہ پہلے بینک کے قبضے اور ضمان میں آئے، حالانکہ مرابحہ کے دُرست ہونے کے لئے اس سامان کا پہلے بینک کے قبضے اور ضمان میں آنا ضروری ہے۔

۴- بینک کے پاس جب کوئی شخص سرمایہ حاصل کرنے کے لئے آتا ہے تو بینک تمویل کی حد مقرّر (تحدید السقف) کردیتا ہے کہ اتنے سرمائے کی حد تک بینک

مرابحہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ معاہدے (Agreements) پر دستخط کرالئے جاتے ہیں، اس وقت بینک اس شخص کو سامان خریدنے کا وکیل بھی بنادیتا ہے، لیکن اس وقت کوئی بیع منعقد نہیں ہوتی، بلکہ وہ محض ایک باہمی معاہدہ ہوتا ہے کہ بینک حسبِ ضرورت ان شرائط پر اپنے گاہک کو اس کی ضرورت کی اشیاء خرید کر فراہم کرے گا۔
اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جب گاہک کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو وہ بینک کو بتائے، پھر بہتر طریقہ تو یہ ہوتا کہ بینک وہ چیز اپنے ذرائع سے خرید کر اپنے قبضے میں لاتا، پھر گاہک کو مـرابـحۃً فروخت کرتا۔ لیکن اگر بینک خود خریدنے کے بجائے اسی گاہک کو خریداری کا وکیل بنائے تو اس میں کم از کم یہ ضروری تھا کہ پہلے گاہک وہ چیز بینک کے وکیل کی حیثیت سے خرید کر بینک کو مطلع کرے، پھر اس سے ایجاب و قبول کرکے اپنے لئے خرید لے۔ یہاں گاہک کی دو حیثیتوں کو ایک دُوسرے سے ممتاز رکھنا ضروری تھا، پہلے اس کی حیثیت وکیل کی ہے، اور جب تک وہ اس حیثیت میں ہے اس پر وکالت کے اَحکام جاری ہوں گے۔ اور جب تک سامان پر اس کا قبضہ بینک کے وکیل کی حیثیت میں ہے، اس وقت تک وہ سامان بینک کی ملکیت میں ہے اور اسی کے ضمان میں ہے، لہٰذا اگر اس دوران وہ سامان وکیل کی کسی تعدّی کے بغیر ہلاک ہوجائے تو بینک کا نقصان ہونا چاہئے۔ پھر جب وہ بینک کو اِطلاع دے کر اس سے وہ سامان اپنے لئے خریدے تو اس وقت سامان گاہک کی ملکیت اور ضمان میں آجائے گا، اور اگر اس کے بعد ہلاک ہو تو گاہک کا نقصان ہوگا۔

گاہک کی ان دو حیثیتوں کا کلی طور پر ایک دُوسرے سے ممتاز ہونا نہایت ضروری ہے، لیکن آج کل اکثر بینک اس بات کا لحاظ نہیں رکھتے بلکہ تـحـدید السقف کے وقت یعنی "Limit" منظور کرتے ہوئے مرابحہ کے معاہدے پر جو دستخط ہوتے ہیں، انہی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ اس کے بعد گاہک سامان خود خرید کر اسے اپنے استعمال میں لاتا رہتا ہے، اور بینک سے خریداری کے لئے کوئی الگ ایجاب و قبول نہیں کیا جاتا۔ جس کے نتیجے میں یہ محض ایک مصنوعی کارروائی ہوجاتی ہے، اور عملی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ بینک نے گاہک کو رقم دی، اور ایک مدّت کے بعد زیادہ رقم وصول

کرلی۔ سامان کا بینک کے ضمان میں آنا، پھر اس کی ملکیت کا گاہک کی طرف منتقل ہونا، اور اسی مقصد کے لئے ایجاب وقبول وغیرہ کچھ نہیں ہوتا، یہ طریقہ بالکل حرام اور ناجائز ہے۔

۵- یہ غلطی بھی ہوتی ہے کہ تمویل کی حد مقرر کرنے (تحدید السقف) کے معاہدے پر دستخط ہوتے ہی بینک اس شخص سے "Bill of Exchange" (ہنڈی) یا پرامیسری نوٹ پر دستخط کرالیتا ہے۔ یہ اس لئے غلط ہے کہ ہنڈی پر دستخط تو اس وقت ہوتے ہیں جب کوئی شخص مدیون بن جاتا ہے، اور یہ شخص ابھی بینک کا مدیون نہیں بنا، ابھی تو آئندہ مرابحہ مؤجلہ کرنے پر آمادگی کا معاہدہ ہوا ہے، گاہک بینک کا مدیون اس وقت بنے گا جب وہ سامان بینک سے اپنے لئے خرید لے گا، لہٰذا پیرامیسری نوٹ پر دستخط بھی اسی وقت ہونے چاہئیں۔

۶- سودی نظام میں قرضے کی ادائیگی کا وقت آجائے اور مقروض ابھی قرض ادا کرنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو یا ابھی ادا نہ کرنا چاہتا ہو تو اس قرض کی مدت بڑھادی جاتی ہے، پہلا سود قرضے میں شامل ہوجاتا ہے اور اس پر مزید سود لگا کر مزید مہلت دے دی جاتی ہے، اس کو "Roll Over" (رول اوور) کرنا کہتا ہیں۔ مرابحہ میں بھی یہی سلسلہ شروع کردیا گیا، مرابحہ کی ثمن کی ادائیگی کا وقت آنے پر ادائیگی کی استطاعت نہ ہوتو یہاں بھی قرض کو رول اوور کردیتے ہیں، حالانکہ یہ تو ایک بیع تھی، اس میں سامان کی ایک قیمت طے تھی، اس قیمت میں اب اضافہ یا کمی ممکن نہیں، نہ اس مرابحہ پر مزید مرابحہ کیا جاسکتا ہے، مرابحہ کی حقیقت اور شرائط کو ملحوظ نہ رکھنے کی وجہ سے اس جیسی خرابیاں پیدا ہوجاتی ہیں، جن کی وجہ سے معاملہ شرعی طور پر جائز نہیں رہتا، اس لئے مرابحہ پر عمل کرنے کے لئے اس کی شرائط کی رعایت بہت ضروری ہے۔

اب مرابحہ مؤجلہ سے متعلق چند مسائل ذکر کئے جاتے ہیں:-

دَین کا وثیقہ

مرابحہ مؤجلہ میں سامان کا ثمن خریدار کے ذمے دَین ہوجاتا ہے، لہٰذا بینک

دَین کے وثیقے کے طور پر کفالت یا رہن کا مطالبہ کرسکتا ہے، رہن کی مختلف صورتیں آج کل رائج ہیں، ان کے شرعی اَحکام پر تفصیلی بحث میرے عربی رسالہ "احکام البیع بالتقسیط" میں موجود ہے، یہاں اس کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

ثمن کی توثیق کے لئے مختلف صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں:-

۱- مبیع کو ہی بطور وثیقے کے اپنے پاس رکھ لیا جائے، اس کا حکم یہ ہے کہ استیفاء ثمن کے لئے حبسِ مبیع کے طور پر مبیع کو اپنے پاس رکھنا جائز نہیں۔ اس لئے کہ بیع مؤجل (اُدھار بیع) میں بائع کو حبسِ مبیع کا حق نہیں ہوتا،[1] البتہ بطور رہن کے مبیع کو اپنے پاس رکھا جاسکتا ہے، بشرطیکہ خریدار مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد پھر رہن رکھے۔[2] حبسِ مبیع اور رہن میں فرق یہ ہے کہ حبسِ مبیع کی صورت میں مبیع مضمون بالثمن ہوگا اور اس کے ہلاک ہوجانے سے بیع فسخ ہوجائے گی، اور رہن کی صورت میں وہ سامان مضمون بالقیمہ ہوگا اور اس کے ہلاک ہونے سے بیع فسخ نہیں ہوگی۔

۲- آج کل رہن کی ایک صورت رائج ہے جس کو "الرهن الساذج" (Simple Mortgage) یا "الذمة السائلة" (Floating Charge) کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ رہن راہن کے قبضے میں ہی رہتا ہے، وہ اس کو استعمال بھی کرتا رہتا ہے، مرتہن رہن پر قبضہ نہیں کرتا، البتہ مرتہن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ بروقت دَین کی ادائیگی نہ کرنے کی صورت میں اس کو بیچ کر دَین وصول کرسکتا ہے۔ اور راہن دَین ادا کرنے سے پہلے رہن کو خود تو استعمال کرتا رہتا ہے، مگر اس کی ملکیت کسی اور کی طرف منتقل نہیں کرسکتا۔

اس رہن میں اِشکال یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں مرہون شے کا قبضہ مرتہن کی طرف منتقل نہیں ہوتا، جبکہ ظاہر یہ ہے کہ مرتہن کا قبضہ رہن کی صحت کے لئے ضروری ہے لیکن بعض وجوہ کی بنا پر (جن کی تفصیل مذکورہ رسالے میں موجود ہے) رہن کی یہ صورت جائز معلوم ہوتی ہے۔

---

(۱) الهندية ج:۳ ص:۱۵۰، کتاب البیوع، الباب الرابع۔

(۲) رد المحتار مع الدر المختار ج:۶ ص:۴۹۰، کتاب الرهن۔

۳- دَین کی توثیق کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی تیسرے شخص کو ضامن بنالیا جائے، جس کو فقہی اِصطلاح میں ''کفالہ'' کہا جاتا ہے، یہ صورت بھی جائز ہے، اور اس کے تفصیلی اَحکام فقہاء نے لکھے ہیں، لیکن اس پر اُجرت یا فیس لینا شرعاً جائز نہیں ہے۔

ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ

سودی نظام میں تو ادائیگی میں تاخیر کی صورت میں خودبخود سود بڑھتا رہتا ہے، جس کے ڈر سے مدیون دَین بروقت ادا کردیتا ہے، مگر مشارکہ، مضاربہ یا مرابحہ میں یہ صورت نہیں ہوتی، اس لئے لوگ غلط فائدہ اُٹھاکر ادائیگی میں تاخیر کرتے ہیں، اس کے سدِّ باب کا کیا طریقہ ہو؟ یہ مسئلہ علمائے معاصرین میں موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔

اتنی بات تو طے شدہ ہے کہ ادائیگی میں تاخیر مدیون کے اعسار (نادار ہونے) کی وجہ سے ہو تو اس کا حکم قرآنِ پاک نے بیان کردیا ہے:-

''وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ''

یعنی مدیون کو کسی قسم کے اضافے کے بغیر مزید مہلت دینی چاہئے، لیکن اگر وہ مماطل ہو، یعنی سرمایہ پاس ہونے کے باوجود بلاوجہ تاخیر کر رہا ہو تو اس کا سدِّ باب کیسے ہو؟

اس سلسلے میں بعض علمائے معاصرین نے مدیون پر تاخیر کی صورت میں تعویضِ مالی (Compensation) عائد کرنے کو جائز قرار دے دیا ہے، اور اس پر بعض بینکوں میں عمل ہو رہا ہے۔ جس کا فارمولا یہ وضع کیا گیا ہے کہ پہلے تو اس کے مماطل ہونے کی تحقیق کے لئے ایک ماہ تک اس کو نوٹس دیئے جائیں گے، اگر ایک ماہ کے نوٹس کے باوجود بھی اس نے ادائیگی نہ کی تو اَب اس نے جتنی مدّت تاخیر کی ہے، دیکھا جائے گا کہ بینک کے ''انوسٹمنٹ اکاؤنٹ'' (حساب الإستثمار) میں اس مدّت میں کتنا نفع ہوا ہے؟ اسی حساب سے اس پر ہرجانہ لازم کیا جائے گا جو حکومت کو نہیں بلکہ متضرر فریق یعنی بینک کو ملے گا۔ مثلاً بینک کے انوسٹمنٹ اکاؤنٹ میں پانچ فیصد نفع ہوا ہے، تو دَین کا پانچ فیصد اس پر بطور ہرجانہ کے لازم ہوگا، اگر بینک کو اس

دوران کوئی نفع نہیں ہوا تو اس سے بھی کچھ نہیں لیا جائے گا۔

لیکن اکثر علماء ''تعویضِ مالی'' کے قائل نہیں، اس کے جواز پر جو دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ مخدوش ہیں (اس کی تفصیل میرے رسالہ "احکام البیع بالتقسیط" میں موجود ہے)۔ شرعاً تو اس کا جواز مخدوش ہے ہی، عملاً بھی مفید نہیں، اس لئے کہ اس سے مدیون پر ادائیگی کے لئے دباؤ نہیں پڑے گا، اس لئے کہ ''انوسٹمنٹ اکاؤنٹ'' کا نفع عموماً کم ہوتا ہے اور مرابحہ کی شرح زیادہ ہوتی ہے، لہٰذا کوئی شخص زیادہ شرح کے ساتھ طویل مدّت کے لئے مرابحہ کرنے کی بجائے کم مدّت کے لئے مرابحہ کرکے ادائیگی میں تاخیر کرے گا اور ''تعویضِ مالی'' کو برداشت کرلے گا اور اس میں اپنے لئے دباؤ نہیں، بلکہ نفع محسوس کرے گا ______ لہٰذا تاخیر کے سدّ باب کا معقول طریقہ وہ ہے جو میں نے ابتداءً پیش کیا تھا اور بعد میں کافی مقبول ہوا۔ وہ یہ کہ مرابحہ یا اجارہ کے معاہدے (Agreement) میں مدیون یہ بات بھی لکھے کہ اگر میں نے ادائیگی میں تاخیر کی تو اتنی رقم کسی خیراتی کام میں خرچ کروں گا۔ یہ رقم دَین کے تناسب سے بھی طے کی جاسکتی ہے، ایسی رقم سے ایک خیراتی فنڈ بھی قائم کیا جاسکتا ہے، اس فنڈ سے کسی کی امداد بھی کی جاسکتی ہے، اور اس سے لوگوں کو بلاسود قرض بھی دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ رقم بینک کی آمدنی میں شامل نہیں ہوگی۔ یہ طریقہ زیادہ مفید اس لئے ہے کہ اس طریقے میں رقم کی شرح متعین نہیں زیادہ سے زیادہ بھی رکھی جاسکتی ہے، اس سے مدیون پر دباؤ ہوگا۔

اس کا جواز یہ ہے کہ یہ رقم نہ جرمانہ ہے اور نہ رِبوا، بلکہ مدیون کی طرف سے التزام ہے، جس کو ''یمین اللجاج'' کہتے ہیں، اس التزام کا ذکر امام حطاب رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''تحریر الکلام فی مسائل الالتزام'' میں کیا ہے:۔

> اما اذا التزم المدعی علیه للمدعی انه ان لم یوفه حقه فی وقت کذا و کذا فله علیه کذا و کذا، فهذا لا یختلف فی بطلانه لأنه صریح الربا ______ الی قوله: وما اذا التزم انه ان لم یوفه حقه فی وقت کذا فعلیه کذا لفلان

او صدقة للمساكين فهذا هو محل الخلاف المعقود له هذا الباب فالمشهور انه لا يقضى به كما تقدم وقال ابن دينار يقضى به. (ص:۱۷۶، طبع بیروت)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ اِلتزام دیانۃً بالاتفاق لازم ہوتا ہے، اور قضاءً لازم ہونے میں اختلاف ہے، موجودہ ضرورت کی بنا پر ان حضرات کے قول پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں، جو قضاءً بھی اس کے لازم ہونے کے قائل ہیں۔

قبل از وقت ادائیگی کی صورت میں دَین میں کمی کرنا

اگر مدیون اپنا قرضہ مقرّرہ وقت سے پہلے ادا کردے تو سودی نظام میں سود کم ہوجاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرابحہ کے ثمن میں کمی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں:-

۱- ایک پہلو وہ ہے جس کو فقہاء کے ہاں ''ضع وتعجل'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، یعنی مدیون اپنے دائن سے یہ کہے کہ تم دَین کی کمی کر کے قبل از وقت وصول کرلو۔ اس کے حکم میں فقہاء کا مشہور اختلاف ہے، لیکن جمہور کے ہاں ناجائز ہے، اور یہی صحیح ہے۔ (دلائل کی تفصیل رسالہ ''احكام البيع بالتقسيط'' میں ہے)۔

۲- بعض متأخرین حنفیہ نے مرابحہ مؤجلہ میں حلولِ اجل سے پہلے ادائیگی کی صورت میں ثمن میں کمی کرنا جائز قرار دے دیا ہے۔

لیکن بینکوں کو اگر اس کی کھلی چھٹی دے دی جائے تو مرابحہ اور سودی نظام میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا، اس لئے مناسب یہ ہے کہ معاہدے میں تو یہ صراحت نہ ہو کہ پہلے ادائیگی کرنے سے قیمت کم ہوجائے گی، لیکن اگر کوئی شخص قبل از وقت ادائیگی کردے تو اس وقت کسی سابق قرارداد کے بغیر کمی کردی جائے تو مضائقہ نہیں۔

اسلامی طریقہ ہائے تمویل کی جزوی تطبیق

اب تک تمویل کے وہ طریقے اُصولی طور پر بتائے گئے ہیں جو شرعی اُصولوں کے مطابق ہوسکتے ہیں۔ اب یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان طریقوں کی بینک کی

جزئیات پر تطبیق کیسے ہو؟ جب تک بینک کے ایک ایک جزوی معاملے پر ان طریقوں کو منطبق نہ کیا جائے تو عملی طور پر نظام چلانا مشکل ہے، اس لئے اب بینک کے جزوی معاملات پر مختصراً گفتگو کی جاتی ہے۔

یہ بات پہلے (بینک کے وظائف بیان کرتے ہوئے) تفصیل سے بتائی جا چکی ہے کہ بینک کی تمویل کے تین طریقے ہوتے ہیں۔ تمویل کی تین صورتوں کو شرعی سانچے میں ڈھالنے کے لئے یہ غور کرنا ہوگا کہ یہاں کونسا اسلامی طریقۂ تمویل اختیار کیا جائے۔

"تمويل المشاريع" (Project Financing) میں شرکت، مضاربہ، اجارہ اور مرابحہ سب طریقوں سے تمویل ہوسکتی ہے، اجارہ اس طرح کہ مشینری خرید کر بینک اجارے پر دیدے۔ مرابحہ اس طرح کہ مشینری خرید کر نفع پر مرابحۃً بیچ دی جائے۔ شرکت اور مضاربہ کو طویل المیعاد تمویل میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

"تمويل رأس المال العامل" (Working Capital Financing) میں خاص معاملات کی حد تک مشارکہ اور مضاربہ ہوسکتا ہے، مثلاً بینک جو سرمایہ دے رہا ہے اس سے رُوئی خریدی جائے گی، اس سے کپڑا وغیرہ بنا کر جو نفع حاصل ہوگا اس میں بینک شریک ہوگا، اور خام مال کی ضرورت ہو تو اس میں مرابحہ بھی ہوسکتا ہے۔

"Over Head Expenses" (وہ اخراجات جن کا براہِ راست پیداوار سے تعلق نہیں ہوتا، مثلاً تنخواہیں، کرایہ جات، بلوں کی ادائیگی وغیرہ) ان میں تمویل بہت مشکل ہے، یہاں اجارے اور مرابحہ کا امکان ہی نہیں، یہاں دو ہی راستے ہیں ایک مشارکہ کا طریقہ ہے، جتنی رقم کی ضرورت ہے، بینک اتنی رقم دے کر کاروبار کے کسی حصے میں شریک ہو جائے، جب بطور شرکت کے ادارے کو رقم مل گئی تو وہ کاروبار کی کسی بھی ضرورت میں خرچ کرسکتا ہے۔ دُوسرا طریقہ بلاسود قرض کا ہے، اس میں بینک وہ اخراجات لے سکتا ہے جو اس قرض کا حساب کتاب رکھنے کے لئے ہوئے ہیں۔ اس میں اصل تو یہی ہے کہ حقیقی اخراجات وصول کئے جائیں، مگر ایک ایک قرضے پر ہونے والے حقیقی اخراجات معلوم کرنا تقریباً ناممکن ہے، اس لئے اس بات کی گنجائش معلوم

ہوتی ہے کہ بینک انتظامی کاموں کی ''اُجرتِ مثل'' وصول کرلے، اُجرتِ مثل سے تجاوز نہ کیا جائے۔ اس کی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ فتویٰ پر اُجرت لینا ناجائز ہے، مگر کتابتِ فتویٰ کی اُجرت لینا جائز ہے، یہاں فقہاء نے یہ مسئلہ لکھا ہے کہ کتابت کی اُجرت ''اُجرتِ مثل'' سے متجاوز نہیں ہونی چاہئے۔

درآمد میں اسلامی بینکوں کا کردار

پہلے یہ بتایا جاچکا ہے کہ موجودہ نظام میں بینک کا درآمد اور برآمد میں بھی بڑا کردار ہوتا ہے، درآمد (Import) کی صورت میں بینک ایل-سی کھولتا ہے، اس پر اپنی خدمت کی اُجرت، کفالت کی اُجرت اور قرض ہو تو اس پر سود بھی لیتا ہے، (جیسا کہ تفصیل پہلے گزر چکی ہے)، شرعی نقطۂ نظر سے کفالت کی اُجرت اور قرض پر سود لینا شرعاً جائز نہیں تو ایل-سی کے متبادل دو چیزیں ہوسکتی ہیں۔

موجودہ اسلامی بینکوں میں عام طور پر ایل-سی کے معاملات مرابحہ کے طور پر انجام پاتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ جس چیز کو درآمد کرنا تھا بینک اس میں وکیل بننے کے بجائے خود اس کو خرید کر درآمد کرتا ہے، اور مـــرابـــحةً اس شخص کو بیچ دیتا ہے جو درآمد کرنا چاہتا تھا۔ ایل-سی کی فیس وغیرہ کو مرابحہ کی شرح میں شامل کرلیتا ہے، مرابحہ کی شرائط ملحوظ رکھی جائیں تو اصولی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں، تاہم عملاً یہ طریقہ پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا، اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک یہ کہ اس طریقے میں بہت سے مراحل پر مرابحہ کی شرائط پوری کرنا مشکل ہوتا ہے، اور بسااوقات عملاً بہت سی شرائط پوری بھی نہیں ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں بینک کا اس چیز کو خرید کر مرابحہ کرنا محض ایک مصنوعی کارروائی ہے، اس لئے کہ درآمد کنندہ پہلے بائع سے پورا معاملہ طے کرچکا ہوتا ہے، صرف منگوانے کے وقت بینک بیچ میں آجاتا ہے، سرکاری کاغذات میں اور قانونی اعتبار سے درآمد کنندہ (Importer) بینک کو نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اصل مشتری کو ہی سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے ملک سے جو بائع مال بھیجتا ہے وہ بھی بینک کو خریدار نہیں سمجھتا ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ مرابحہ کے جواز کے لئے یہ ضروری ہے

کہ وہ چیز جو درآمد کی جارہی ہے، پہلے بینک کے ضمان میں آئے، جبکہ بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا ہے ـــــــ ان وجوہ کی بنا پر ایل-سی کا معاملہ مرابحہ کے طور پر کرنا پسندیدہ نہیں، تاہم اگر مرابحہ کی شرائط کا لحاظ صحیح شرعی طریقے سے ہو تو معاملہ جائز ہے۔

ایل-سی کا صحیح متبادل یہ ہے کہ یہ معاملہ شرکت یا مضاربت کے طریقے پر کیا جائے۔ اگر ایل-سی زیرو مارجن پر ہو تو مضاربہ ہوگا اور بینک ربّ المال اور امپورٹر مضارب ہوگا۔ اور اگر ایل-سی کھلوانے والا بھی کچھ رقم لگا رہا ہے تو شرکت ہوگی۔ مشارکہ یا مضاربہ کی صورت یہ ہوگی کہ بینک امپورٹر سے کہے گا کہ مال کی قیمت ہم ادا کردیتے ہیں اور مال کو بیچنے سے جو نفع آئے گا وہ طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے گا۔ اس میں یہ صورت بھی قابلِ غور ہوسکتی ہے کہ بینک ایک مخصوص مدت کے لئے مشارکہ کرے، اس وقت تک اگر سامان فروخت ہوکر نقد رقم مل گئی تو نفع طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے، اور اگر سامان بازار میں فروخت نہیں ہوا تو امپورٹر بینک کا حصہ خرید کر اسے ادائیگی کردے۔

برآمد میں اسلامی بینکوں کا کردار

برآمد کے سلسلے میں بینک کے دو کردار ہیں، ایک یہ کہ وہ ایکسپورٹر کا بینک (Negotiating Bank) ہونے کی حیثیت سے کئی خدمات انجام دیتا ہے، مثلاً مال روانہ کرنے کے کاغذات (Bill of Lading) بھیجتا ہے، امپورٹر سے رقم وصول کرتا ہے اور ان خدمات کی اُجرت وصول کرتا ہے وغیرہ۔ اس میں تو شرعاً کوئی اشکال نہیں، اس لئے کہ یہ تمام افعال ایسے ہیں، جن کی اُجرت لینا جائز ہے۔ بینک کا دُوسرا کردار یہ ہے کہ برآمد کنندہ (Exporter) کو مال خریدنے یا تیار کرانے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ سرمایہ بینک فراہم کرتے ہیں، جس کو "تمویل الصادرات" (Export Financing) کہتے ہیں۔ "تمویل الصادرات" کی دو قسمیں ہیں، ان دونوں کو سمجھ کر دونوں کا شرعی طریقِ کار الگ الگ سمجھنا چاہئے ـــــــ تمویل کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باہر سے آرڈر ہے، مگر مال خریدنے اور تیار کرنے کے لئے

سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، اس مقصد کے لئے بینک تمویل کرتا ہے، اس کو "تمویل قبل الشحن" (Pri Shipment Financing) کہتے ہیں۔ دُوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ ایکسپورٹر نے مال خرید کر تیار کر کے بھیج دیا ہے، مگر رقم آنے میں کچھ دیر لگے گی، اتنی مدّت کے لئے وہ چاہتا ہے کہ بینک سے اپنی رقم مل جائے، اس کو "تمویل بعد الشحن" (Post Shipment Financing) کہتے ہیں۔ سودی نظام میں تو ان دونوں صورتوں میں سود پر قرضہ دے دیا جاتا ہے، ان دونوں قسم کی تمویل کا شرعی طریقہ کیا ہو؟ یہاں اس پر گفتگو کرنی ہے۔

پہلی قسم یعنی "تمویل قبل الشحن" کے دو طریقے ہوسکتے ہیں:-

۱- بہت سے اسلامی بینکوں میں یہ صورت چل رہی ہے کہ بینک ایکسپورٹر سے وہ مال خود خرید کر اس کو قیمت ادا کر دیتا ہے۔ ایکسپورٹر نے اپنے امپورٹر سے جو قیمت طے کی ہوتی ہے، بینک اس سے کم قیمت پر مال ایکسپورٹر سے خریدتا ہے اور ایکسپورٹر نے جو قیمت غیر ملکی خریدار سے طے کر رکھی ہے اس پر اپنی طرف سے مال اس کو روانہ کرتا ہے، جس سے بینک کو نفع ہو جاتا ہے۔

لیکن اس طریق کار میں کئی قباحتیں ہیں، وہ یہ کہ اس طریقے میں بیع کے شرعی تقاضے عموماً پورے نہیں ہوتے ہیں، مثلاً اب ایکسپورٹر بینک کو قرار دینا چاہئے، مگر بینک کے اس مال کو خرید لینے کے بعد بھی عمیل (جو شخص بینک سے سرمایہ لینے آیا تھا) کو ہی ایکسپورٹر سمجھا جاتا ہے، اور ایکسپورٹ کی سرکاری مراعات بھی اسی کو ملتی ہیں۔ دوسرے ملک میں مال منگوانے والا (Importer) بھی بینک کو بائع نہیں سمجھتا، عمیل ہی کو سمجھتا ہے، حتیٰ کہ مال میں عیب وغیرہ کا دعویٰ بھی عموماً عمیل پر ہی ہوتا ہے، بینک پر نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ بیع محض ایک مصنوعی کارروائی ہے، اگر قباحتوں کو دُور کر کے واقعتاً بیع کی حقیقت پائی جائے تو یہ طریقہ قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔

یہاں ایک ضمنی وضاحت ضروری ہے کہ موجودہ نظام میں بھی مال روانہ کرنے کے کاغذات (Bill of Lading) وغیرہ بینک کے نام پر ہی بنتے ہیں، اس پر "To The Order of The Bank" لکھا ہوا ہوتا ہے، اور رقم اور کاغذات کی وصولی بھی

بینک ہی کرتا ہے، اس سے یہ غلط فہمی نہیں پیدا ہونی چاہئے کہ حقوق عقد بینک کی طرف راجع ہوگئے ہیں۔ اس لئے کہ بینک کا نام اس لئے نہیں لکھا جاتا کہ وہ حقیقتاً عاقد ہے، بلکہ بینک کا نام صرف بطور وثیقے کے لکھا جاتا ہے، جب تک بینک اور عمیل کے معاملات صاف نہ ہوں گے، بینک کاغذات نہیں دے گا۔

۲- اس تمویل کی بہتر صورت یہ ہے کہ بینک اور عمیل کے درمیان شرکت یا مضاربہ کا معاہدہ ہو، اگر عمیل بھی کچھ سرمایہ لگا رہا ہو تو شرکت ہوگی اور اگر وہ اپنا سرمایہ نہ لگا رہا ہو تو مضاربہ کا عقد ہوگا۔ عمیل بینک سے سرمایہ لے کر مال خریدے گا یا تیار کرے گا، پھر باہر بھیجے گا، اور جو نفع ہوگا وہ تقسیم ہوجائے گا۔ اس صورت میں مشارکہ یا مضاربہ آسان بھی ہے، اس لئے کہ عمیل کا دوسرے ملک کے خریدار (امپورٹر) سے معاہدہ ہوچکا ہے اور قیمت بھی طے ہوچکی ہے، ادھر مال کی تیاری پر لاگت کا بھی اندازہ ہے، تو اس بات کا بہ سہولت اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس معاملے کے نتیجے میں کتنا نفع ہوگا؟ ـــــــ البتہ اس میں ایک مشکل ہوسکتی ہے کہ عمیل نے مال مطلوبہ صفات کے خلاف بھیج دیا تو دوسری طرف مال وصول نہیں کیا جائے گا اور اس میں بینک کا بھی نقصان ہوگا۔ اس کا حل یہ ہوسکتا ہے کہ مشارکہ یا مضاربہ کے معاہدے میں بینک یہ شرط لگادے کہ مال مطلوبہ صفات کے مطابق بھیجنا ہوگا، اب بھی اگر اس نے مطلوبہ صفات کے خلاف مال بھیجا تو اس کا ذمہ دار وہ عمیل ہوگا، بینک اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ شرط کی مخالفت کی وجہ سے یہ عمیل کی طرف سے تعدی ہے، اور تعدی کی صورت میں شریک یا مضارب کو ضامن بنایا جاسکتا ہے۔

"تمویل بعد الشحن" (Post Shipment Financing) اس کا وہی طریقہ ہوتا ہے جو "بل آف ایکسچینج" کی ڈسکاؤنٹنگ کا ہوتا ہے، ایکسپورٹر مال روانہ کرچکا ہے، اب اس کے پاس اس مال کا بل ہے، اس بل کو وہ بینک کے حوالے کردیتا ہے اور بینک اس کی پختگی (Maturity) کو سامنے رکھ کر اس میں کٹوتی کرکے باقی رقم ایکسپورٹر کو دے دیتا ہے، اور پختگی (Maturity) کی تاریخ آنے پر بینک یہ رقم امپورٹر سے

وصول کر لیتا ہے، جیسا کہ بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔

یہاں پہلے "خصم الکمبیالۃ" (بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ) کے شرعی حکم پر گفتگو کی جاتی ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کی فقہی حیثیت یہ ہے کہ دائن جس کے ہاتھ میں بل ہے وہ دَین کا بٹہ لگانے والے (Discounter) کی طرف حوالہ کر دیتا ہے۔ اور یہ حوالہ بأنقص من الدّین ہے جو ناجائز ہے، اس لئے کہ یہ ربٰوا الفضل ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کے اس معاملے کو "بیع الدّین" نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ بیع اور حوالہ میں یہ فرق ہوتا ہے کہ بیع کے بعد دائن بری الذمہ ہو جاتا ہے، اور دَین کے تمام حقوق اس شخص کی طرف راجع ہو جاتے ہیں جس سے دَین کو خریدنا ہوتا ہے۔ اور "حوالہ" میں مُحِیل ہی دائن رہتا ہے، وہ بری الذمہ نہیں ہوتا، اگر محتال کو دَین نہ ملے تو وہ محیل کی طرف رُجوع کا حق دار ہوتا ہے، اور آج کل ڈسکاؤنٹنگ میں صورتِ حال یہی ہوتی ہے کہ اگر "بٹہ لگانے والے" (Discounter) کو بل وصول نہ ہو تو وہ اصل دائن سے رُجوع کرتا ہے، لہٰذا یہ "بیع الدّین من غیر من علیہ الدّین" نہیں، بلکہ "حوالۃ الدّین بانقص من الدّین" ہے۔

اس کی متبادل صورت کے لئے شروع میں احقر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یہاں دو معاملے الگ الگ کئے جائیں۔ ایک یہ کہ بل میں کٹوتی کرنے کے بعد جتنی رقم باقی بچتی ہے اتنی رقم کا قرض لے لیا جائے۔ دُوسرا معاملہ یہ ہے کہ اس کو دَین وصول کرنے کا وکیل بنا دے اور اس وکالت پر اُجرت طے کر دے۔ اب بینک بہ حیثیت وکیل دَین وصول کر کے اس میں سے اپنی اُجرت وصول کر لے اور باقی سے دَین کا مقاصہ کر لے، مثلاً سو روپے کا بل ہو تو بینک نوے روپے قرض دیدے اور بینک کو بل وصول کرنے کا وکیل بنا دیا جائے جس کی اُجرت دس روپے گی۔ اب بینک تاریخ آنے پر سو روپے وصول کر کے اس میں سے دس روپے اپنی اُجرت رکھ لے اور نوے روپے سے اپنے دَین کا مقاصہ کر لے ــــــــــ لیکن اس تجویز میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ عموماً وکالت کی اُجرت کو بل کی رقم کی تعداد کے ساتھ مربوط کیا جائے گا، بل

کی رقم زیادہ ہوتو اُجرت بھی زیادہ ہوگی اور رقم کم ہوتو اُجرت بھی کم ہوگی۔ دُوسری بات یہ کہ اُجرت کو مدّت کے ساتھ بھی مربوط کیا جائے گا، بل کی پختگی زیادہ مدّت کے بعد ہونی ہوتو اُجرت زیادہ ہوگی، اور پختگی کم مدّت میں ہونی ہوتو اُجرت کم ہوگی۔ اب یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اُجرت کو رقم کی تعداد اور مدّتِ پختگی کے ساتھ مربوط کرنا دُرست ہے یا نہیں؟ اُجرت کو رقم کی تعداد کے ساتھ مربوط کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دَلالی (سمسرۃ) کی اُجرت کو مالیت کے ساتھ وابستہ کرنے میں اختلاف ہے، لیکن علامہ شامیؒ نے جواز کو ترجیح دی ہے۔[۱] یعنی دلال نے زیادہ مالیت کی چیز بیچی ہے تو زیادہ اُجرت لینا، اور کم مالیت کی چیز میں دلال بنا ہے تو کم اُجرت لینا جائز ہے۔ اس کی جو وجہ علامہ شامیؒ نے لکھی ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ گو یہاں مالیت کم یا زیادہ ہونے کی صورت میں دَلال کی محنت اور عمل برابر ہے، مگر اُجرت مقرّر کرتے ہوئے صرف عمل اور محنت کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ اُجرت مقرّر ہونے میں عمل کی قدر اور نوعیت کا بھی دخل ہوتا ہے، کم مالیت کی چیز کی دلالی کی قدر کم ہے، اور زیادہ مالیت کی چیز کی قدر زیادہ ہے، لہٰذا اس کی بنا پر اُجرت میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔[۲] اس پر قیاس کرتے ہوئے وکالت کی اُجرت کو مقدارِ رقم کے ساتھ وابستہ کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، مگر اُجرت کو مدّت اور زمانے کے ساتھ مربوط کرنے کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے کہ یہ "عینہ" والی شکل ہے کہ بلاسود قرض دے کر قرض کی مدّت کے حساب سے وکالت کی اُجرت وصول کرلی گئی یعنی جو سود قرض پر نہیں لیا جاسکا، وہ وکالت کی اُجرت بڑھا کر وصول کرلیا گیا اس لئے یہ تجویز پسندیدہ نہیں۔ لہٰذا جب تک "تمويل بعد الشحن" کی کوئی بے غبار شرعی صورت سامنے نہ آئے، اس وقت تک اس قسم کی تمویل بند ہی رکھنی ہوگی اور تمام معاملات "تمويل قبل الشحن"

---

(۱) الدر المختار ج:۶ ص:۶۳، باب الإجارة الفاسدة۔

(۲) الدر المختار کتاب الإجارة، مسائل شتی ج:۶ ص:۹۲، طبع ایم سعید کمپنی۔

(Pre Shipment Financing) ہی کی بنیاد پر کئے جائیں گے، اور اگر ایکسپورٹ کی قیمت حاصل ہونے سے پہلے ایکسپورٹر کو رقم کی ضرورت ہو تو وہ بینک سے کوئی نیا مشارکہ، مضاربہ یا مرابحہ کرسکتا ہے۔

''اعادۃ تمویل الصادرات'' کا حکم

درآمد، برآمد میں بینک کا کردار بیان کرتے ہوئے یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ ''اسٹیٹ بینک آف پاکستان'' نے برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے ایک اسکیم جاری کی ہے جس کو "Export Refinancing Scheme" ''اعادۃ تمویل الصادرات'' کہتے ہیں، اس اسکیم کے دو طریقوں کی وضاحت بھی وہاں ہوچکی ہے، یہاں ان کے شرعی حکم پر گفتگو پیشِ نظر ہے۔

اس اسکیم کا پہلا طریقہ یہ تھا کہ ''اسٹیٹ بینک'' تجارتی بینکوں کو قرض دیتا تھا اور اس پر پانچ فیصد سود لیتا تھا، اس کے سود ہونے میں تأمل کی بھی ضرورت نہیں، لیکن یہ طریقہ ختم کرکے جو نیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اس میں ''اسٹیٹ بینک'' تجارتی بینک کو باقاعدہ قرض نہیں دیتا بلکہ اس کے نام اکاؤنٹ کھول دیتا ہے، جس میں سے تجارتی بینک کو رقم لینے کا حق نہیں ہوتا، یہ حقیقت میں قرض کا معاملہ نہیں، بلکہ محض ایک کاغذی کارروائی (ہزل) ہے۔ اس پر ''اسٹیٹ بینک'' ٹریژری بل کے حساب سے جو رقم تجارتی بینک کو دیتا ہے، اس پر بھی اشکال نہیں، اس لئے کہ وہ اسٹیٹ بینک کی طرف سے ایکسپورٹ کی حوصلہ افزائی کے لئے ابتداءً انعام کی حیثیت میں ہے، کسی معاملے کے نتیجے میں نہیں۔ البتہ اسٹیٹ بینک تجارتی بینک سے پانچ فیصد لے کر یہ نفع دیتا ہے جو عموماً ۱۳ یا ۱۴ فیصد ہوتا ہے، اس میں ربا الفضل کا شبہ ہے، لہٰذا اگر اسٹیٹ بینک پانچ فیصد تجارتی بینک سے لینا چھوڑ دے، اس کی بجائے وہ اس نفع کی مقدار کم کردے جو وہ خود دے رہا ہے، مثلاً ۱۳ فیصد کی بجائے ۸ فیصد کردے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔ اور سب سے بے غبار طریقہ یہ ہے کہ چونکہ اسٹیٹ بینک کا اصل

مقصد برآمدات کی حوصلہ افزائی کے لئے بینکوں کو اِمداد (Subsidy) دینا ہے، تاکہ وہ کم نفع رکھ کر برآمدات کی تمویل کریں، لہٰذا اس کے لئے وہ براہ راست اِمداد دے۔

غیر مصرفی مالیاتی اِداروں کا شرعی حکم

اس سے پہلے "Non-Banking Financial Institutions" (N.B.F.I) یعنی المؤسسات المالية غير المصرفية کا اور ان کی اَقسام کا قدرے تعارف پیش کیا جاچکا ہے۔ اس وقت ان میں سے اکثر مالیاتی ادارے سودی ہیں، ان کا بنیادی کام تمویل ہی ہے، لہٰذا ان کو شرعی اُصولوں کے مطابق چلانے کا طریقِ کار بھی وہی ہوگا جو بینکوں کے بارے میں پیش کیا گیا ہے۔ البتہ یہاں ان چار اداروں پر گفتگو ہوجانی چاہئے جن کو ''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے سب سے پہلے سود سے پاک کرنے کے لئے منتخب کیا تھا، وہ چار اِدارے یہ تھے:-

۱- "N.I.T"، ۲- "I.C.P"، ۳- "H.B.F.C"، ۴- اسمال انڈسٹریز فنانس کارپوریشن۔ ان کو سود سے پاک کرنا آسان تھا، اس لئے ''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے سب سے پہلے ان کے بارے میں تجاویز پیش کی تھیں، یہاں ان کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱- نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ (N.I.T)

پہلے بتایا جاچکا ہے کہ یہ اِدارہ (نیشنل انوسٹمنٹ ٹرسٹ) دس روپے کی قیمت اسمیہ (Face Value) کے یونٹ جاری کرتا ہے، لوگ یونٹ لے کر اپنی رقم جمع کراتے ہیں، ان رقموں سے جو فنڈ تیار ہوتا ہے اس سے سرمایہ کاری کی جاتی ہے، اور نفع (Dividend) کی شکل میں یونٹ ہولڈرز میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس کے نظام پر جب غور کیا گیا تو اس میں دو باتیں قابلِ اشکال سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ "N.I.T" کی زیادہ سرمایہ کاری شیئرز میں ہوتی ہے، اور اس سلسلے میں ہر طرح کی کمپنی کے شیئرز لے لئے جاتے تھے، بینک اور سودی اِداروں کے شیئرز اور ایسی کمپنیوں کے شیئرز بھی

لئے جاتے تھے جن کا بنیادی کاروبار ہی حرام ہے، اس کے تدارک کے لئے "N.I.T" کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ سودی اور حرام کاروبار والے اِداروں اور کمپنیوں کے شیئرز نہیں لئے جائیں گے۔ دُوسرا اِشکال یہ تھا کہ "N.I.T" کے یونٹ ہولڈرز کو اعتماد میں لینے کے لئے حکومت نے اس بات کی ضمانت دی ہوئی تھی کہ اگر نقصان ہوا تو حکومت ادا کرے گی، بلکہ نفع نہ ہونے کی صورت میں ڈھائی فیصد تک نفع بھی حکومت دے گی، جبکہ حکومت خود "N.I.T" میں شریک بھی تھی۔ اور ایک شریک کا دُوسرے شرکاء کے لئے نقصان کا ضامن بننا یا نفع کا ذمہ دار بننا جائز نہیں۔ اس اِشکال کو حل کرنے کے لئے یہ تجویز زیرِ غور آئی کہ حکومت "N.I.T" سے اپنا حصہ ختم کرلے، تو پھر یہ شریک کی ضمانت نہیں ہوگی، بلکہ طرفِ ثالث کی ضمانت ہوگی۔ لہٰذا یہ بات قابلِ غور بن گئی کہ طرفِ ثالث کا نفع نہ ہونے کی صورت میں ڈھائی فیصد کی حد تک نفع کا اور نقصان کی صورت میں نقصان کا ضامن بننا دُرست ہے یا نہیں؟ فقہِ حنفی کی رُو سے تو اس کی گنجائش نہیں، جس کی دو وجہیں ہیں:-

۱- کفالت اس حق کی صحیح ہوتی ہے جو خود لازم اور مضمون ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ''ودیعت'' اور ''عاریت'' کی کفالت صحیح نہیں ہوتی۔ شرکت اور مضاربہ میں سرمایہ مضمون نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے نقصان کی کفالت لازم و نافذ نہیں ہوگی۔ یہ محض ایک وعدہ ہوگا جو قضاءً لازم نہیں ہوتا۔

۲- ہدایہ وغیرہ میں ہے: "ضمان الخسران باطل" جس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو کہے کہ تم یہ عقد یا کاروبار کرلو، اگر اس میں خسارہ ہوا تو میں ضامن ہوں گا، تو ضمانت باطل ہے، نافذ نہیں ــــــ البتہ مالکیہ کے ہاں طرفِ ثالث کی یہ ضمانت قضاءً لازم ہوسکتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسا وعدہ جس کی وجہ سے موعود لہٗ کو کسی مؤنۃ میں داخل کیا گیا ہو یا اس کو کسی کام پر آمادہ کیا گیا ہو وہ قضاءً بھی لازم ہوجاتا ہے۔ اس کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں حکومت نے طرفِ ثالث ہونے کی حیثیت سے ڈھائی فیصد نفع اور نقصان نہ ہونے کی ضمانت دے کر لوگوں کو "N.I.T" میں شرکت کی دعوت دی ہے، اس لئے یہ ضمانت قضاءً بھی نافذ

ہوگی۔[1] لہٰذا طرفِ ثالث کی ضمانت کو نافذ قرار دے کر حکومت کا حصہ "N.I.T" سے ختم کردیا گیا، اور اس ضمانت کو نافذ قرار دے دیا گیا، یہی وجہ ہے کہ "N.I.T" کے اشتہارات میں یہ لکھا ہوا ہوتا ہے کہ ڈھائی فیصد نفع یقینی ہے۔

چنانچہ ان تجاویز کی روشنی میں حکومت کی طرف سے احکام جاری ہوئے اور ابتداءً "N.I.T" نے ان کے مطابق کام بھی کیا، مگر کارکردگی کی مسلسل نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے "N.I.T" میں تبدیلی آئی، اس کی وجہ سے نظام پھر غیر شرعی بن گیا، تبدیلی یہ آئی کہ "N.I.T" کے پاس سرمایہ زیادہ جمع ہوگیا، اور شیئرز میں سرمایہ کاری کو ناکافی سمجھا گیا تو "N.I.T" نے اور کئی طریقوں سے سرمایہ کاری شروع کردی اور وہ طریقے شرعاً ناجائز تھے، مثلاً

۱- مارک اَپ پر کاروبار شروع کردیا، اور مارک اَپ کا وہی غیر شرعی طریقہ اختیار کیا گیا جو بینکوں میں چلتا ہے۔

۲- بینکوں کی طرح اجارہ شروع کردیا، جس میں وہ شرعی خامیاں موجود تھیں جو پہلے بتائی گئی ہیں۔

۳- "P.T.C" کی ناجائز شکل اختیار کی گئی، پی.ٹی.سی کی حقیقت اور اس کا پس منظر سمجھنا بھی یہاں ضروری ہے۔

---

(۱) بعض علماء نے فقہِ حنفی سے "ضمان خطر الطریق" والے جزیئے کی رُو سے حنفیہ کے ہاں بھی اس ضمانت کو لازم قرار دیا ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ کسی نے دُوسرے کو کہا: "اسلک هذا الطریق، فانه آمن، فان هلک مالک فعلیّ" اس کے کہنے پر وہ اس راستے پر چلا اور اس کا مال ضائع ہوگیا تو وہ ضامن ہوگا (شامی ج:۴ ص:۱۷۰، کتاب الجہاد) یہاں یہ ضمان اس شخص پر فی نفسہ لازم نہیں تھا، صرف اس وعدے کی وجہ سے لازم ہوا ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی طرف ثالث کے وعدے کی وجہ سے یہ ضمان لازم قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ قیاس صحیح معلوم نہیں ہوتا، اس لئے کہ "ضمان خطر الطریق" کے لازم ہونے کی علت دھوکا ہے، یہ کہہ کر کہ اس راستے میں نقصان نہیں ہوگا اس نے دھوکا دیا ہے۔ مگر زیرِ بحث صورت میں حکومت کی طرف سے دھوکا نہیں، اس لئے کہ حکومت کی ضمانت کا یہ مطلب نہیں کہ "N.I.T" میں نقصان ہوگا ہی نہیں، حکومت کا مقصد تو سرمایہ کاروں کی ترغیب کے لئے تحفظ کا احساس دلانا ہے۔

''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے معیشت کو سود سے پاک کرنے کی جو تجاویز پیش کی تھیں، ان میں "P.T.C" (پی.ٹی.سی) کی تجویز بھی شامل تھی۔ جس کا حاصل یہ تھا کہ یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ کمپنی کو کبھی سرمائے کی فراہمی کے لئے بانڈز جاری کرنے پڑتے ہیں جو سودی ہوتے ہیں، اس کا متبادل یہ پیش کیا گیا تھا کہ کمپنی مضاربہ کی دستاویزات جاری کرے گی، جس کا نام "Participation Term Certificate" (پارٹیسپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) ہوگا۔ یہ ایک معینہ مدّت کے لئے مضاربہ کے سرٹیفکیٹ ہوں گے، جو شخص یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرے گا وہ اس معینہ مدّت میں کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہوجائے گا۔ بوقتِ ضرورت وہ اپنے اس حصے کو بیچ بھی سکے گا۔

یہ تجویز بعد میں کمپنی لاء کا حصہ بنی اور متعدّد کمپنیوں نے ''پی.ٹی.سی'' جاری کئے۔ این.آئی.ٹی نے بھی جاری کرنے شروع کردیئے، لیکن اس میں پیچیدہ قسم کی تبدیلیاں کرکے اس کو جاری کیا گیا، جس کی وجہ سے یہ ناجائز شکل اختیار کرگئے۔

۴- طویل المیعاد سرمایہ کاری کے لئے ٹی ایف سی جاری کئے گئے، یعنی پی.ٹی.سی سے ملتے جلتے دستاویزات جاری کئے گئے جن کا نام "Term Financ Certificate" (ٹرم فنانس سرٹیفکیٹ) تھا۔

اس کے بعد این.آئی.ٹی کے کاروبار میں پھر کچھ اصلاح ہوئی، جس میں مرابحہ اور اجارہ کے معاہدات (Agreements) کو دُرست کردیا گیا، ''پی.ٹی.سی'' کو ختم کردیا گیا اور ''ٹی.ایف.سی'' کو مرابحہ میں بدل دیا گیا۔ البتہ اب بھی این.آئی.ٹی کی دو مدیں ناجائز ہیں۔ ایک یہ کہ بینکوں کے ''پی.ایل.ایس'' اکاؤنٹ میں رقم رکھی جاتی ہے، جس کا سود آتا ہے۔ دُوسری یہ کہ ''پی.ٹی.سی'' آئندہ کے لئے تو ختم کردیئے گئے مگر پہلے سے جو چل رہے ہیں ان میں سے کچھ کی پختگی (Maturity) نہیں ہوئی، یعنی ان کی مدّت پوری نہیں ہوئی، اس لئے فارم میں یہ شق رکھ دی گئی کہ ''میں پی.ایل.ایس اور پی.ٹی.سی کی آمدنی نہیں لینا چاہتا'' فارم میں یہ لکھ دینے کے بعد این.آئی.ٹی یونٹ لینے کی گنجائش پیدا ہوگئی۔ لیکن اب بھی عملاً کام دُرست ہونے کا کوئی اعتماد نہیں، جب تک مسلسل نگرانی کا کوئی انتظام نہ ہو۔

۲- انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان (I.C.P)

''انوسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان'' کا تعارف پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، اس کی سرمایہ کاری صرف کمپنیوں کے شیئرز میں ہوتی ہے، اور اُصولی طور پر اس کو اس بات کا پابند کیا گیا تھا کہ صرف ان کمپنیوں کے شیئرز لئے جائیں جن کا کاروبار بنیادی طور پر جائز ہو۔ مگر عملاً ایسا ہو رہا ہے یا نہیں؟ اس کو بیلنس شیٹ وغیرہ میں دیکھ کر حکم بتانا چاہئے۔

۳- اسمال انڈسٹریز فنانس کارپوریشن

یہ اِدارہ چھوٹی صنعتوں کو سرمایہ فراہم کرنے کے لئے وجود میں آیا تھا، پہلے سود پر قرضے دیتا تھا، پھر ''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے مرابحہ، اجارہ وغیرہ میں تمویل کی سفارش کی۔

۴- ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن (H.B.F.C)

یہ اِدارہ ''ہاؤس فنانسنگ'' یعنی گھر بنانے یا خریدنے کے لئے سرمایہ فراہم کرتا تھا، مغربی روایتی اِدارے تو اس مقصد کے لئے سود پر قرضے دیتے ہیں اور مکان کو رہن رکھ لیتے ہیں۔

''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے ہاؤس فنانسنگ کے لئے جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک نئی قسم کا معاہدہ تھا جس کو ''شرکت متناقصہ'' (Decreasing Partnership) کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ تمویلی اِدارے اور عمیل (Client) یعنی مکان کے خواہش مند کے مشترک سرمائے سے مکان خریدا یا بنایا جائے گا۔ دونوں کے درمیان اپنے اپنے سرمائے کے تناسب سے مکان میں ''شرکت ملک'' ہوگی، مثلاً ۲۵ فیصد سرمایہ عمیل کا اور ۷۵ فیصد اِدارے کا تھا، تو مکان دونوں کے درمیان ارباعاً مشترک ہوگا۔ ایک چوتھائی حصہ عمیل کا اور تین چوتھائی حصے اِدارے کے ہوں گے۔ مکان بننے کے بعد عمیل کارپوریشن کے حصے میں کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے رہے گا اور کارپوریشن کو کرایہ ادا کرے گا، اس کے ساتھ ساتھ مختلف وقفوں میں کارپوریشن کے حصے کو تھوڑا

تھوڑا کر کے خریدتا بھی رہے گا، اس مقصد کے لئے کارپوریشن کے حصے کے متعدد یونٹ بنالئے جاتے ہیں، مثلاً کارپوریشن کا حصہ دس یونٹوں میں خریدا جائے گا، جوں جوں خریدنے کے نتیجے میں کارپوریشن کا حصہ کم ہوتا جائے گا، اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہوتا جائے گا۔ جب عمیل کارپوریشن کے سارے حصے کو خرید لے گا تو کارپوریشن کی ملکیت ختم ہوجائے گی اور عمیل سارے مکان کا مالک بن جائے گا، اب کرایہ دینے کا سلسلہ بھی ختم ہوجائے گا۔

فقہی نقطۂ نظر سے یہاں تین عقود ہوئے۔ ۱-شرکتِ ملک، ۲-اِجارہ، ۳-بیع۔ یہ تینوں عقد بغیر کسی شرطِ سابق کے الگ الگ ہوں تو ان کے جواز میں کوئی اشکال نہیں۔ مگر عملاً یہاں ایک معاہدے میں تین عقد ایک دُوسرے کے ساتھ مشروط یا المعروف کالمشروط ہوں گے، اور اس طرح معاہدے کے بغیر چارۂ کار بھی نہیں۔ یہ صورتِ حال فقہی طور پر قابلِ غور ہے، یہاں یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ ایک عقد میں دوسرے عقد کی شرط لگانا اس وقت ناجائز ہے جبکہ صلب عقد میں دُوسرے عقد کی شرط لگائی گئی ہو، لیکن اگر صورتِ حال یہ ہو کہ ایک دفعہ کئی عقود کا اس طرح اِکٹھا معاہدہ کرلیا جائے کہ ابھی کوئی عقد انجام نہیں پارہا ہے، فی الحال صرف ان کے انجام پانے کا معاہدہ کیا جارہا ہے، پھر وہ عقود اپنی اپنی جگہ اور اپنے اپنے وقت پر انجام پائیں گے اور جب ان میں سے کوئی عقد عملاً ہورہا ہوگا اس وقت دُوسرے عقد کی کوئی شرط نہیں ہوگی، تو اس صورت پر "صفقة فی صفقة" یا "بیع و شرط" کے اَحکام جاری نہیں ہوں گے۔ اس کی نظیر "بیع بالوفاء" ہے، جس کے بارے میں فقہاء کا اِختلاف ہوا ہے، اور صحیح یہ ہے کہ وفاء کی شرط صلب بیع میں ہو تو ناجائز ہے، اور اگر بیع مطلق عن الشرط ہو اور وفا کا معاہدۂ بیع الگ سے کیا گیا ہو تو یہ جائز ہے، اور وعدۂ وفا قضاءً بھی لازم ہوجائے گا۔ بیع کے بعد تو وفا کا جواز بہت سے فقہاء نے لکھا ہے، اور بیع سے پہلے وفا کے وعدے کا نفاذ بھی " جامع الفصولین" میں مصرّح ہے۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ صلب عقد میں دُوسرے عقد کی شرط لگانا جائز نہیں، البتہ عقد سے پہلے یا بعد میں

(۱) جلد اوّل ص:۲۳۶، الفصل الثامن عشر۔

دُوسرے عقد کا معاہدہ کرنا جائز ہے۔ شرط لگانے اور وعدے میں فرق یہ ہے کہ صلب عقد میں شرط لگانے سے بیع کا انعقاد ہی دُوسرے عقد سے معلق ہوتا ہے، یعنی اگر دُوسرا عقد ہوگا تو بیع منعقد ہوگی ورنہ بیع بھی منعقد نہیں ہوگی۔ اور بیع ان عقود میں سے ہے جو تعلیق کو قبول نہیں کرتے ہیں جبکہ الگ سے وعدہ کرنے کی صورت میں بیع کی تعلیق لازم نہیں آتی ـــــــ اس تفصیل کی رُو سے شرکتِ متناقصہ کا جواز معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ پہلے ایک بار تین عقود کا معاہدہ ہوجاتا ہے، پھر ہر عقد اپنے اپنے وقت پر بغیر کسی شرط کے ہوتا رہتا ہے، لہٰذا مذکورہ تجویز کے مطابق اگر ''ہاؤس فنانسنگ'' کا کام کیا جائے تو وہ جائز ہوگا۔ مگر یہاں بھی مسلسل نگرانی کے نقدان کی وجہ سے عملاً بہت سی شرعی قباحتیں پیدا ہوجاتی ہیں، چنانچہ ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن اس وقت جس طرح کام کررہی ہے، اس میں متعدّد شرعی قباحتیں موجود ہیں۔

ہاؤس فنانسنگ کو عربی میں "التمویل العقاری" کہتے ہیں، اور اس موضوع پر احقر کا ایک مستقل مقالہ ہے جو احقر کی عربی کتاب "بحوث فی قضایا فقھیة معاصرة" میں شائع ہوچکا ہے۔

''کینیڈا'' میں ''ہاؤس فنانسنگ'' کے لئے ایک ''کوآپریٹو سوسائٹی'' بھی قائم کی گئی ہے، جس کے لوگ ممبر بنتے ہیں اور ممبر ہی اس سے سرمایہ حاصل کرکے مکان خریدتے یا بناتے ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ سوسائٹی کا نفع پھر ممبران کو مل جاتا ہے اور ممبران ہی کو فائدہ ہوتا ہے۔

بیمہ

تأمین (Insurance)

بیمہ بھی آج کل کاروبار کا بڑا حصہ بن گیا ہے، کوئی بھی بڑی تجارت اس سے خالی نہیں ہوتی۔ بیمہ کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو مستقبل میں جو خطرات درپیش ہوتے ہیں کوئی انسان یا اِدارہ ضمانت لیتا ہے کہ فلاں قسم کے خطرات کے مالی اثرت کی میں تلافی کردُوں گا۔ مشہور یہ ہے کہ اس کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ دُوسرے ممالک کی تجارت میں مال بحری جہاز سے روانہ کیا جاتا تھا، بحری جہاز ڈُوب بھی جاتے تھے اور مال کا نقصان ہوتا تھا، بحری جہاز کے نقصان کی تلافی کے لئے ابتداءً بیمہ کا آغاز ہوا۔ علامہ شامیؒ نے بھی ''مستأمن'' کے اَحکام میں ''سوکرہ'' کے نام سے اس کا ذکر کیا ہے۔[1] جن خطرات کے خلاف بیمہ کیا جاتا ہے، ان خطرات کے لحاظ سے بیمہ کی تین بڑی قسمیں ہیں:-

۱- تأمین الأشیاء (Goods Insurance):- اس کا طریقِ کار یہ ہوتا ہے کہ جو شخص کسی سامان کا بیمہ کرانا چاہتا ہے وہ معین شرح سے بیمہ کمپنی کو فیس ادا کرتا رہتا ہے، جسے ''پریمیم'' (Premium) کہتے ہیں، اور چونکہ پریمیم اکثر قسط وار اَدا کیا جاتا ہے اس لئے عربی میں اسے ''قسط'' کہتے ہیں۔ اور اس چیز کو حادثہ لاحق ہونے کی صورت میں کمپنی اس کی مالی تلافی کردیتی ہے۔ اگر اس سامان کو جس کا بیمہ کرایا گیا تھا کوئی حادثہ پیش نہ آئے تو بیمہ دار نے جو پریمیم ادا کیا ہے، وہ واپس نہیں ہوتا۔ البتہ حادثے کی صورت میں بیمے کی رقم بیمہ دار کو مل جاتی ہے جس سے وہ اپنے نقصان کی تلافی کرلیتا ہے۔ اس میں جہاز کا بیمہ، گاڑی کا بیمہ، مکان کا بیمہ وغیرہ داخل ہوگئے۔

---

(۱) ردالمحتار ج:۴ ص:۱۷۰، ایچ ایم سعید کمپنی۔

۲-تـامین المسئولیة :--جس کا حاصل یہ ہے کہ کسی پر مستقبل میں کوئی ذمہ داری آسکتی ہے، اس ذمہ داری سے نمٹنے کے لئے بیمہ کرایا جاتا ہے، مثلاً گاڑی روڈ پر لانے سے حادثے کے نتیجے میں کسی دُوسرے کا نقصان ہوجانے کا خطرہ ہے، اس صورت میں چلانے والے پر مالی تاوان لازم ہوجائے گا، اس کا بیمہ کرالیا جاتا ہے اور حادثے کے وقت تاوان کی ادائیگی بیمہ کمپنی کرتی ہے۔ اس کو عموماً "Third Party Insurance" (تھرڈ پارٹی انشورنس) کہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں گاڑی سڑک پر لانے کے لئے یہ انشورنس قانوناً ضروری ہے۔ بعض مغربی ممالک میں یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنے گھر کے سامنے سے برف صاف نہ کی اور کوئی شخص اس برف سے پھسل گیا جس سے اس کا جسمانی نقصان ہوا تو وہ گھر والے پر مقدمہ کرکے اس سے بھاری تاوان وصول کرتا ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لئے بھی گھر کے مالکان بیمہ کرالیتے ہیں، یہ بھی "تـامین المسئولیة" کی ایک شکل ہے، جس میں اگر تاوان دینا پڑے تو بیمہ کمپنی تاوان ادا کرتی ہے۔

۳-تامین الحیاۃ :--جس کو "Life Insurance" (بیمہ زندگی) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی بیمہ دار سے یہ معاہدہ کرتی ہے کہ اگر ایک مخصوص مدّت میں بیمہ دار کا انتقال ہوگیا تو بیمہ کمپنی طے شدہ رقم اس کے ورثاء کو اَدا کرے گی۔ اس کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں، بعض صورتوں میں مدت مقرّر ہوتی ہے، اس مدّت میں انتقال ہوگیا تو بیمہ کی رقم ورثاء کو مل جائے گی، اگر اس مدّت میں انتقال نہ ہوا تو مدّت ختم ہونے سے بیمہ ختم ہوجاتا ہے اور رقم مع سود کے واپس مل جاتی ہے۔ بعض صورتوں میں مدّت مقرّر نہیں ہوتی، جب بھی انتقال ہوگا تو بیمہ کی رقم ورثہ کو مل جاتی ہے۔

"تـامین الأشیاء" اور "تـامیـن الحیاۃ" میں بنیادی فرق یہ ہے کہ "تـامین الأشیـاء" کی صورت میں وہ خطرہ پیش نہ آئے تو جو قسطیں (پریمیم) ادا کی تھیں وہ رقم واپس نہیں ملتی ہے۔ اور "تـامین الحیاۃ" میں معینہ مدت میں وفات نہ ہونے کی صورت میں دی ہوئی رقم بمع سود واپس مل جاتی ہے۔

بیمہ کی طریقِ کار اور ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے تین قسمیں اور ہیں:-

۱- "التامین الإجتماعی" :- حکومت کوئی ایسا طریقہ اختیار کرتی ہے جس میں افراد کے کسی مجموعے کو اپنے کسی نقصان کی تلافی یا کسی فائدے کے حصول کی سہولت حاصل ہوجاتی ہے، اسے "گروپ انشورنس" کہتے ہیں۔ مثلاً ملازمین کی تنخواہوں سے تھوڑی سی رقم ہر ماہ کاٹ کر اسے ایک فنڈ میں جمع کرلیا جاتا ہے، پھر ملازم کی وفات یا کسی حادثے کی صورت میں بھاری رقمیں ورثاء کو یا خود ملازم کو ادا کی جاتی ہیں۔ اس کی بے شمار صورتیں ہیں، ان تمام پر ایک اِجمالی حکم لگانا مشکل ہے، ہر صورت کا حکم الگ ہوگا۔

۲- "التامین التبادلی" یا "التأمین التعاونی":- اس کو انگریزی میں "Mutual Insurance" کہتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ جن کے خطرات ایک ہی نوعیت کے ہوتے ہیں وہ آپس میں مل کر ایک فنڈ بنالیتے ہیں اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم میں سے کسی کو کوئی حادثہ پیش آیا تو اس فنڈ میں سے اس کے نقصان کی تلافی کی جائے گی، اس فنڈ میں صرف ممبران کی رقم ہوتی ہے، اور نقصان کی تلافی بھی صرف ممبران کی حد تک ہوتی ہے، سال کے بعد حساب کرلیا جاتا ہے، اگر ادا کئے گئے معاوضات فنڈ کی رقم سے بڑھ جائیں تو اسی حساب سے ممبران سے مزید رقم وصول کر لی جاتی ہے، اور اگر فنڈ میں رقم بچ جائے تو ممبران کو واپس کردی جاتی ہے یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے لئے فنڈ میں حصے کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

ابتداءً بیمے کی یہی شکل چلی تھی، اور شرعاً اس میں کوئی اِشکال نہیں، اور جتنے علماء نے بیمے پر گفتگو کی ہے، وہ اس کے جواز پر متفق ہیں۔

۳- "التامین التجاری" یا "التأمین بقسط ثابت":- جس کو انگریزی میں (Commercial Insurance) کہتے ہیں۔ اس کا طریق کار یہ ہے کہ بیمہ کمپنی قائم کی جاتی ہے، اس کمپنی کا مقصد بیمے کو بطور تجارت کے اختیار کرنا ہوتا ہے، اور اس کا اصل مقصد بیمے کے ذریعے نفع کمانا ہوتا ہے، جیسے دُوسری کمپنیاں مختلف کاروبار سے نفع کماتی ہیں۔ یہ کمپنی مختلف قسم کے بیمے کی اسکیمیں جاری کرتی ہے، جو بیمہ کرانا چاہتا ہے اس کے ساتھ بیمہ کمپنی کا معاہدہ ہوتا ہے کہ اتنی رقم کی اتنی قسطیں آپ ادا کریں

گے اور نقصان کی صورت میں کمپنی آپ کے نقصان کی تلافی کرے گی۔ کمپنی قسطوں کا تعین کرنے کے لئے حساب کرلیتی ہے کہ جس خطرے کے خلاف بیمہ ہوا ہے وہ کتنی بار متوقع ہے؟ تاکہ ان کے معاوضات ادا کرکے کمپنی کو نفع بچ سکے۔ اس حساب کے لئے ایک مستقل فن ہے جس کے ماہر کو ''ایکچوری'' (Actuary) کہتے ہیں۔

بیمے کی اسی قسم کا رواج زیادہ ہے، اور اسی کا شرعی حکم علمائے معاصرین میں زیادہ محلِ بحث بنا ہے۔ اس کے بارے میں علمائے عرب میں سے شیخ ابوزہرۃ اور مصطفیٰ الزرقاء کا شدید اِختلاف رہا ہے۔ شیخ ابوزہرۃ اس کی حرمت کے قائل تھے، اور مصطفیٰ زرقاء اس کے جواز کے قائل تھے۔ اس وقت عالمِ اسلام کے تقریباً تمام مشاہیر علماء اس کی حرمت کے قائل ہیں، البتہ مشاہیر میں سے صرف دو عالم اس کے جواز کے قائل ہیں، ایک شیخ مصطفیٰ زرقاء اور دُوسرے شیخ علی الخفیف۔

جمہور کا موقف یہ ہے کہ اس بیمے میں قمار بھی ہے اور ربا بھی۔ قمار اس لئے کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہے اور دُوسری طرف سے ادائیگی موہوم ہے، جو قسطیں ادا کی گئی ہیں وہ تمام رقم ڈُوب بھی سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی مل سکتی ہے، اسی کو قمار کہتے ہیں۔ اور ربا اس طرح کہ یہاں روپے کا روپے سے تبادلہ ہے اور اس میں تفاضل ہے کہ بیمہ دار کی طرف سے کم رقم دی جاتی ہے اور اسے زیادہ رقم ملتی ہے۔ البتہ "تأمین الحیاۃ" (بیمہ زندگی) میں قمار نہیں، اس لئے کہ وہاں رقم یقیناً واپس مل جاتی ہے، مگر ربا اور غرر ہے۔ ربا تو ظاہر ہے، غرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ارکانِ عقد (ثمن، مبیع یا اجل) میں سے کسی چیز کا مجہول ہونا یا کسی مجہول اور غیر معین واقعے پر موقوف ہونا۔ یہاں غرر اس طرح ہے کہ معلوم نہیں کہ کتنی رقم واپس ہوگی، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جتنی رقم دی تھی وہی بمعہ سود کے واپس ملے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حادثے کی صورت میں زیادہ رقم مل جائے۔

مصطفیٰ زرقاء اور شیخ علی الخفیف کے دلائل کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں، البتہ ان کے دلائل کا حاصل اور خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے دلائل کا خلاصہ چند باتیں ہیں:-

۱- قمار اور بیمے میں فرق ہے، قمار باقاعدہ عقد نہیں، محض ایک لعب اور ہزل ہے، اور بیمہ باقاعدہ ایک عقد اور جدّ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس عقد کا قمار، ربا اور غرر پر مشتمل ہونا ہم واضح کر چکے ہیں، قمار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ لعب یا ہزل ہو، جدّ ہونے کی صورت میں بھی قمار متحقق ہوجاتا ہے۔

۲- یہاں معقود علیہ وہ روپے نہیں جو حادثے کی صورت میں کمپنی ادا کرتی ہے، بلکہ وہ اَمان اور اِطمینان ہے جو بیمے کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، اور اَمان کا معاوضہ ادا کرنا جائز ہے۔ اس کے لئے وہ چوکیدار کی مثال پیش کرتے ہیں کہ چوکیدار کی تنخواہ اس اَمان کا معاوضہ ہوتا ہے جو اس چوکیدار کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اَمان معقود علیہ نہیں، معقود علیہ روپے ہی ہیں، اور اَمان اس کا ایک ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ چوکیدار کی مثال میں بھی چوکیدار کا عمل معقود علیہ ہوتا ہے، اَمان اس کا ثمرہ ہوتا ہے، اور چونکہ چوکیدار کا عمل معقود علیہ بن سکتا ہے، اس لئے وہ جائز ہے۔ لیکن روپے کو معقود علیہ بنانے کی صورت میں مساوات شرط ہے جو بیمے میں مفقود ہے۔

۳- "التأمین التبادلی" (Mutual Insurance) کے جواز کے تو تمام علماء قائل ہیں، اور "التأمین التجاری" (Commercial Insurance) بھی اس کی ایک وسیع صورت ہے، بڑے پیمانے پر لوگوں کو ممبر بننے کا موقع دینے کے لئے ایک وسیع ادارہ تشکیل دے دیا گیا ہے، اس کے منتظمین کو اِنتظامات کی اُجرت ملنی چاہئے، بیمہ کمپنی کو جو نفع ملتا ہے وہ اس کے انتظامات کی اُجرت ہے۔ اس اِستدلال کا حاصل یہ ہے کہ "التامین التجاری" بھی "التامین التبادلی" کی طرح ہے۔۔۔۔۔ اس کا جواب یہ ہے کہ "التأمین التبادلی" ایک تبرّع ہے اور "التأمین التجاری" معاوضہ ہے۔ تبرّع میں غرر متحمل ہوتا ہے، عقدِ معاوضہ میں غرر متحمل نہیں ہوتا۔

۴- ان کا ایک اِستدلال یہ بھی ہے کہ "بیمہ" ایک عقدِ جدید ہے، اور اَصل عقود میں اباحت ہوتی ہے، جب تک اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ اور بیمے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے، اس میں کوئی قباحت نہیں، لہٰذا اس کی گنجائش ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بیمے کی شرعی خامیاں قمار، ربا اور غرر ہم نے بیان کردی ہیں، لہٰذا یہاں

اباحتِ اصلیہ کا قاعدہ نہیں چل سکتا۔

بیمہ کا متبادل

بیمہ کا متبادل ایک تو تعاونی بیمہ (Mutual Insurance) ہے، جس میں شرکاء اپنی اپنی مرضی سے فنڈ میں رقمیں جمع کراتے ہیں، اور سال کے دوران جن جن لوگوں کو کوئی نقصان پہنچا، اس فنڈ سے ان کی امداد کرتے ہیں، پھر سال کے ختم پر اگر رقم بچ گئی تو وہ شرکاء کو بحصہ رسدی واپس کردی جاتی ہے، یا ان کی طرف سے آئندہ سال کے فنڈ کے لئے چندے کے طور پر رکھ دی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ اب عالمِ اسلام کے کئی ملکوں میں "شرکات التکافل" کے نام سے کچھ کمپنیاں قائم ہوئی ہیں، جنھیں تجارتی بیمے کے متبادل کے طور پر قائم کیا گیا ہے، ان کا بنیادی تصوّر یہ ہے کہ ہر بیمہ دار کمپنی کا شیئر ہولڈر ہوتا ہے، کمپنی اپنا سرمایہ نفع بخش کاموں میں لگا کر اس کا نفع اپنے شیئر ہولڈرز میں تقسیم بھی کرتی ہے، اور کمپنی ہی کے ایک ریزرو فنڈ سے بیمہ داروں کے نقصانات کی تلافی بھی کرتی ہے۔

مجھے ابھی ان کمپنیوں کے مفصل طریقۂ کار کی تمام جزئیات پر فقہی نقطۂ نظر سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا، اس لئے ابھی میں اس کے بارے میں کوئی ذمہ دارانہ بات نہیں کہہ سکتا۔

مالیاتِ عامہ
(Public Financing)

اس موضوع سے مراد یہ ہے کہ ملک کے اجتماعی اِخراجات کیا ہوتے ہیں، ان کا تعین کیسے ہوتا ہے، اور ان اِخراجات کی تمویل کیسے ہوتی ہے؟ آئین کے مطابق حکومتیں ٹیکس عائد کرتی ہیں، اور پارلیمنٹ اِخراجات کی تحدید کرکے ان کی اجازت دیتی ہے، ہر سال حکومت کی آمدنی اور اِخراجات کے تعین کے لئے جو دستاویز تیار کی جاتی ہے، اسے اُردو میں ''میزانیہ'' اور انگریزی میں ''بجٹ'' کہتے ہیں۔

بجٹ وفاقی حکومت کا الگ ہوتا ہے، صوبائی حکومتوں کا الگ، اور مقامی انتظامیہ کا الگ ہوتا ہے۔ ایک مجموعی بجٹ وفاقی اور چاروں صوبائی بجٹ کو ملاکر بھی تیار کیا جاتا ہے جس کو "Consolidated Budget" کہتے ہیں۔

بجٹ کے دو حصے ہوتے ہیں، ایک حصے میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ آنے والے سال میں متوقع اِخراجات کیا ہیں؟ اور دُوسرے حصے میں یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ سالِ آئندہ کتنی آمدنی کی توقع ہے؟ اگر متوقع آمدنی اِخراجات کے مقابلے میں کم ہو تو کہا جاتا ہے کہ بجٹ میں خسارہ ہوگیا، اگر آمدنی اور اِخراجات برابر ہوں تو اسے متوازن بجٹ سمجھا جاتا ہے، اور اگر آمدنی اِخراجات سے زائد ہو تو اسے فاضل بجٹ کہا جاتا ہے۔

اِخراجات

اِخراجات دو قسم کے ہوتے ہیں:-

۱- جاری (Current) اِخراجات:- اس سے مراد وہ اِخراجات ہیں جن کا

فائدہ صرف اس دورانئے میں حاصل ہوگا جس کے لئے بجٹ بنایا گیا ہے۔ بجٹ ایک سال کا ہے تو ایک سال کی حد تک ہی فائدہ ہوگا۔ مثلاً حکومت کو جو سود اَدا کرنا ہے وہ جاری اِخراجات میں شامل ہے۔

۲- جامد اِخراجات:- وہ اِخراجات جن کا فائدہ اس دورانئے کے بعد بھی ہوگا، جیسے سڑکوں، پل وغیرہ پر جو اِخراجات ہوئے، ان کو ترقیاتی اِخراجات بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ۹۳-۱۹۹۲ء کے بجٹ میں اخراجات اس طرح ہیں:-

جاری اِخراجات:-	۲۵۷ اَرب روپے
ترقیاتی اِخراجات:-	۷۳ اَرب روپے
کل اِخراجات:-	۳۳۰ اَرب روپے

آمدنی

آمدنی بھی دوقسم کی ہوتی ہے: ۱-محصولاتی، ۲-غیرمحصولاتی۔

محصولاتی آمدنی

اس سے مراد وہ آمدنی ہے جو حکومت کو ٹیکسوں سے حاصل ہوتی ہے، ٹیکس دو قسم کے ہوتے ہیں:-

۱- بلاواسطہ ٹیکس (Direct Tax):- جو اَفراد پر اس طرح عائد ہو کہ وہ اس کا بار کسی اور پر نہ ڈال سکیں، جیسے آمدنی، تنخواہ اور جائیداد پر ٹیکس۔

۲- بالواسطہ ٹیکس (Indirect Tax):- ایسا ٹیکس جس کا بار دُوسرے کی طرف بھی منتقل کیا جاتا ہے، جیسے دُکان اور کارخانے پر ٹیکس کہ دُکان دار یا کارخانہ دار قیمتیں بڑھا کر دُوسروں پر اس کا بار ڈال سکتا ہے۔ یا ''سیلز ٹیکس'' جو وصول تو دُکان دار سے کیا جاتا ہے، لیکن دُکان دار ہر چیز کی فروخت کے وقت یہ ٹیکس اپنے خریدار سے وصول کرلیتا ہے۔

معاشیات میں ٹیکس کے اُصول بھی بتائے جاتے ہیں، ٹیکس لگاتے ہوئے ان

اُصولوں اور خصوصیات کی رعایت ہونی چاہئے۔

۱۔ٹیکس کی تعداد میں ابہام نہ ہو،۲۔ٹیکس کی ادائیگی کا نظام آسان ہو تاکہ ٹیکس ادا کرنے کے لئے لوگوں کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے،۳۔ٹیکس بقدرِ کفایت ہو، حکومت کی ضرورت سے زیادہ بھی نہ ہو اور کم بھی نہ ہو،۴۔تمام طبقات پر مساوی درجے میں عائد ہو، ۵۔اتنا زیادہ ٹیکس نہ ہو کہ اس سے لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہمیں کاروبار کا فائدہ ہی کچھ نہیں ہوتا، لہٰذا اس کے نتیجے میں ملک میں عملِ پیدائش متأثر ہونے لگے، ۶۔ٹیکس کی مقدار لچک دار ہو، اشیاء کی قیمتوں اور آمدنی میں اُتار چڑھاؤ سے خودبخود بدل جاتا ہو، بار بار بدلنا نہ پڑے۔ مثلاً کسی چیز پر مقدار مقرر کرکے ٹیکس لگانا غیر لچک دار ہے، اور قیمت کے فیصدی تناسب سے ٹیکس طے کیا جائے تو یہ لچک دار ہے جو اس چیز کی قیمت بدلنے سے بدلتا رہے گا، ۷۔ٹیکس کا نظام ایسا نہ ہو جو معاشی ترقی پر اثر ڈالے۔

غیر محصولاتی آمدنی

اس سے مراد وہ آمدنی ہے جو سرکاری یا نیم سرکاری اداروں سے حاصل ہوتی ہے، مثلاً واپڈا، فون، پی آئی اے، پوسٹ آفس اور ریلوے وغیرہ سے جو آمدنی حاصل ہوتی ہے وہ غیر محصولاتی آمدنی ہے۔

خسارہ اور خساراتی تمویل

اِخراجات میں سے آمدنی منہا کرکے جو باقی بچے وہ خسارہ ہے، مثلاً پاکستان کے ۹۳-۱۹۹۲ء کے بجٹ میں خسارہ کی صورت یوں ہے:۔

کل اِخراجات:۔ ۳۳۰ اَرب روپے

کل آمدنی:۔ ۲۶۵ اَرب روپے

خسارہ:۔ ۶۵ اَرب روپے

اس خسارے کو پورا کرنے کے لئے سرمایہ فراہم کرنا ''خساراتی تمویل''

کہلاتا ہے، خسارے کی تمویل کے لئے حکومت قرضے لیتی (Deficit Financing) ہے۔ قرضے دو قسم کے ہوتے ہیں:-

۱- بیرونی قرضے (Foreign Loans):- جو دُوسرے ممالک کی حکومتوں یا بین الاقوامی اِداروں سے لئے جاتے ہیں۔

۲- داخلی قرضے (Internal Loans):- جو اندرونی ملک بینکوں، مالیاتی اِداروں یا عوام سے لئے جاتے ہیں۔

پھر داخلی قرضے دو قسم کے ہوتے ہیں:-

۱- غیر بینکی (Non-Banking):- جو عوام سے لئے جاتے ہیں۔ عوام سے قرضے لینے کے لئے ''سرکاری تمسکات'' جاری کئے جاتے ہیں۔ آج کل حکومت کی طرف سے مختلف سیونگ اسکیمیں اسی غرض سے جاری کی گئی ہیں۔ اس میں عام آدمی یہ ''سرکاری تمسکات'' خرید کر پیسے حکومت کو دے دیتا ہے، مثلاً اِنعامی بانڈ، نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ، خاص ڈپازٹ سرٹیفکیٹ وغیرہ۔ ان تمام تمسکات پر آج کل عوام کو سود دیا جاتا ہے۔

۲- بینکی قرضے (Banking Loans):- اس کو ''نوٹ چھاپنے'' سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن واقعتاً حکومت نوٹ نہیں چھاپتی ہے، اس لئے کہ آئینی طور پر نوٹ چھاپنے کا اِختیار حکومت کو نہیں بلکہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو ہے۔ اس تمویل کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت ''ٹریژری بل'' جاری کر کے اسٹیٹ بینک سے قرضہ لیتی ہے، اتنی رقم حکومت کے اکاؤنٹ میں جمع کردی جاتی ہے، اسی کو ''نوٹ چھاپنا'' کہہ دیتے ہیں۔ حکومت جب اسٹیٹ بینک کو اَدائیگی کرتی ہے تو عموماً آج کل اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اتنی رقم کے مزید ''ٹریژری بل'' جاری کردیتی ہے۔ دُوسری صورت یہ ہے کہ حکومت اسٹیٹ بینک کو کہہ دیتی ہے کہ میرے اکاؤنٹ سے اتنی رقم کم کردو۔

پھر قرضے کی تین مدّات ہوتی ہیں جو بجٹ میں لکھی جاتی ہیں:-

۱- مستقل قرضے (Permanent Loans):- یہ وہ قرضے ہیں جو حکومت ''سرکاری تمسکات'' کے ذریعے عوام سے وصول کرتی ہے، جو واپس نہیں کئے جاتے ہیں، البتہ ان ''تمسکات'' کو ثانوی بازار (Secondary Market) میں بیچا جاسکتا ہے جیسے پرائز بانڈ وغیرہ۔

۲- رواں قرضے (Floating Loans):- اس سے مراد وہ قرضے ہوتے ہیں جو حکومت اسٹیٹ بینک سے لیتی ہے۔

۳- قصیر المیعاد قرضے (Unfunded Loans):- اس سے مراد وہ دستاویزات ہیں جو کم مدّت کے لئے ہوں، جیسے ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ، نیشنل ڈپازٹ سرٹیفکیٹ، ماہانہ آمدنی، خاص ڈپازٹ وغیرہ۔

خساراتی تمویل میں زیادہ حصہ داخلی قرضوں کا ہوتا ہے، بیرونی قرضے اس کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں، مثلاً ۹۳-۱۹۹۲ء میں جو قرضے لئے گئے ان کی تفصیل اس طرح ہے:-

داخلی بینکی قرضے:-	۲۱ اَرب روپے
داخلی غیر بینکی قرضے:-	۴۸ اَرب روپے
بیرونی قرضے:-	۱۷ اَرب روپے
کل قرضے:-	۸۶ اَرب روپے

قرضوں کی رقم صافی طور پر لکھی جاتی ہے، یعنی صرف قرضے کی رقم ہی لکھی جاتی ہے، اس پر جو سود اَدا کرنا ہوگا وہ اِخراجات میں لکھا جاتا ہے۔ آج کل ہمارے ملک میں سود کی مقدار اصل رقم سے زیادہ ہوتی ہے، مثلاً ۹۳-۱۹۹۲ء میں حکومت کو جو ادائیگی کرنی ہے وہ یہ ہے:-

اصل قرضے:-	۳۳ اَرب روپے
سود:-	۸۶ اَرب روپے
کل ادائیگی:-	۱۱۹ اَرب روپے

پھر سود میں بھی زیادہ حصہ داخلی قرضوں کا ہوتا ہے، بیرونی سود اس کے مقابلے میں بہت کم ہے، مثلاً مذکورہ بالا ۸۶ اَرب روپے میں ۵۸ اَرب روپے داخلی سود ہے، اور ۱۵ اَرب روپے بیرونی سود ہے، (باقی ۱۳ اَرب روپے کی بجٹ میں وضاحت نہیں کی گئی)۔

اب تک جو قرضے حکومت کے ذمے واجب الادا ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:۔

کل قرضے:۔	۱۳۰۰ اَرب روپے
داخلی:۔	۱۰۰۰ اَرب روپے
بیرونی:۔	۳۰۰ اَرب روپے

داخلی قرضوں کی تفصیل:۔

کل قرضے:۔	۱۰۰۰ اَرب روپے
اسٹیٹ بینک:۔	۶۷۵ اَرب روپے
عام بینک:۔	۱۱۰ اَرب روپے
خاص ڈپازٹ:۔	۲۰۰ اَرب روپے

بیرونی قرضوں کی تفصیل:۔

بیرونی حکومت سے لئے گئے:۔	۱۹۰ اَرب روپے
عالمی اِداروں سے لئے گئے:۔	۱۱۰ اَرب روپے
کل:۔	۳۰۰ اَرب روپے

ان تمام اعداد وشمار سے معلوم ہوگیا کہ حکومت کی تمام ادائیگیوں کا بہت زیادہ حصہ داخلی ہے اور بہت کم حصہ بیرونی ہے۔

خساراتی تمویل کا متبادل طریقہ

جب غیر سودی معیشت کی بات کی جاتی ہے تو خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں سب سے زیادہ مشکل سوال یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر سود پر قرض لینے کا دروازہ بالکل

بند کردیا جائے تو بجٹ خسارہ پورا کرنے کے لئے جو اندرنی اور بیرونی قرضے لئے جاتے ہیں ان کے حصول کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ جہاں تک تجارتی اداروں کا تعلق ہے، ان میں شرکت اور مضاربت متصوّر ہوسکتی ہے، لیکن حکومت کو جن اخراجات کے لئے قرض لینے کی ضرورت پیش آتی ہے ان میں سے بہت بھاری تعداد ایسے کاموں کی ہے جو نفع بخش نہیں ہیں، مثلاً سڑک، پل اور ڈیم وغیرہ بنانا، افواج کے لئے جدید اسلحہ فراہم کرنا، اور اس طرح کے دُوسرے ایسے منصوبے جن کا فائدہ پوری قوم کو پہنچتا ہے، لیکن ان سے براہِ راست کوئی آمدنی نہیں ہوتی۔

اس سوال کے جواب میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ بجٹ کے خسارے کو کم کرنے کے لئے سب سے پہلے ان مسرفانہ اِخراجات کو ختم کرنے کی ضرورت ہے جن کا مظاہرہ شب و روز حکومت کے مختلف اِقدامات میں ہوتا رہتا ہے، اور جن کا ایک غریب ملک میں کوئی جواز نہیں۔ اسی طرح ہمارے ملک میں رِشوت اور بددیانتی کی بنیاد پر بھی بہت بھاری رقمیں ضائع ہوتی ہیں، جن کے سدِّباب کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ حقیقت پھر بھی اپنی جگہ ہے کہ مسرفانہ اِخراجات کو ختم کرنے اور بددیانتی کو دُور کرنے کے باوجود بھی ملکی ضروریات کے پیشِ نظر بجٹ کا خسارہ پورا کرنے کے لئے دُوسرے ذرائعِ تمویل کی ضرورت باقی رہے گی۔ موجود حالات میں اس غرض کے لئے اندرونی و بیرونی قرضے سود پر لئے جاتے ہیں، سود کے خاتمے کے بعد حکومت کی مختلف ضروریات کے لئے مختلف طریقہ ہائے تمویل اختیار کئے جاسکتے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:-

۱- حکومت کے جو اِدارے نفع بخش ہیں، مثلاً ٹیلی فون اور ٹیلی گراف کا محکمہ، ان کی تمویل کے لئے مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاسکتے ہیں، یعنی جو لوگ یہ مضاربہ سرٹیفکیٹ لیں، وہ اس تجارتی اِدارے کے منافع میں بحصۂ رسدی شریک ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی شاہراہ یا پل تعمیر کرنا ہے تو اس کے استعمال پر فیس عائد کی جاسکتی ہے جس سے وہ منصوبہ بھی نفع بخش ہوجائے اور اس میں بھی عوام کو مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کئے جاسکتے ہیں۔

۲- جو منصوبے کسی بھی صورت میں نفع بخش نہ ہوں، ان کی تمویل کے لئے ایسے غیر سودی بونڈ جاری کئے جاسکتے ہیں جن پر کوئی معاوضہ نہ دیا جائے، البتہ ان کے حاملین کو ٹیکس میں چھوٹ دی جائے، ٹیکس کی چھوٹ کو زیادہ سے زیادہ پرکشش بنایا جاسکتا ہے، ٹیکس چونکہ عوام پر حکومت کا کوئی دَین نہیں ہے، اس لئے اس کی معافی یا اس میں رعایت سود میں داخل نہیں ہوگی۔ حکومت ٹیکس لگانے میں اور بعض شعبوں کو چھوٹ دینے میں مختلف عوامل کو پیشِ نظر رکھتی ہے، اگر یہ عامل بھی پیشِ نظر رہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

۳- ایک تجویز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ حکومت کو قرضے دے کر سرکاری تمسکات لینے والوں کو ان کے قرضوں پر کوئی مشروط اور طے شدہ اضافہ تو نہ دیا جائے، لیکن کبھی کبھی کیف ما اتفق کچھ انعام دے دیا جائے۔ جس کے مطالبے کا قانوناً کسی کو کوئی حق نہ ہو، ملائیشیا میں اس تجویز پر عمل ہو رہا ہے۔ چونکہ اس طریقِ کار میں انعام نہ مشروط ہے اور نہ اس کی شرح طے شدہ ہے، اور نہ اس کا ملنا یقینی ہے، اور نہ اس کا قرض دینے والوں کی طرف سے مطالبہ ہے، اس لئے نظریاتی اعتبار سے اس پر ربا کی تعریف صادق نہیں آنے گی۔ لیکن اندیشہ یہ ہے کہ متواتر عمل کے نتیجے میں یہ "المعروف کالمشروط" کی زد میں آجائے۔ لہٰذا ایک تجویز اور بھی ہے کہ اس زیادہ ادائیگی کو ملک کی مجموعی پیداوار کے ساتھ منسلک کر دیا جائے، یعنی قرض کی مدت میں مجموعی قومی پیداوار میں جتنا اضافہ ہو، اتنا ہی اضافہ عوام کو دیا جائے۔ اور اگر کوئی اضافہ نہ ہو تو کوئی اضافہ نہ دیا جائے۔ اس تجویز کے بارے میں ابھی احقر کو نفیاً یا اثباتاً کسی جانب جزم نہیں ہے، لیکن اہلِ علم کو اس پر غور ضرور کرنا چاہئے۔

۴- حکومت کو خود اپنے سرکاری کاموں کے لئے، نیز افواج کے لئے بہت سے مشینی سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اس کی تمویل کے لئے اجارہ کا طریقہ بھی بآسانی اختیار کیا جاسکتا ہے، بعض مالیاتی اداروں سے وہ سامان اجارہ پر حاصل کر لیا جائے۔

۵- اس کے علاوہ ایک کثیر المقاصد طریقِ کار یہ ہوسکتا ہے کہ حکومت اپنے اخراجات کی تمویل کے لئے ایک تجارتی مالیاتی ادارہ قائم کرے، (یہ ادارہ سرکاری

شعبے میں بھی قائم کیا جاسکتا ہے، اور اسے نیم سرکاری بھی بنایا جاسکتا ہے)، یہ ادارہ عوام کے لئے مضاربہ سرٹیفکیٹ جاری کرے، اور ان سرٹیفکیٹ کے ذریعے عوام کی رقموں سے حکومت کو مختلف کاموں میں شرکت، مضاربت، اجارہ اور مرابحہ کی بنیاد پر تمویل کرے، جن کا تفصیلی طریقِ کار بینکاری کے بیان میں گزر چکا ہے۔ اس تمویل کے نتیجے میں جو آمدنی حاصل ہو، وہ مضاربہ سرٹیفکیٹ کے حاملین میں بحصۂ رسدی تقسیم کی جائے۔ یہ مضاربہ سرٹیفکیٹس ثانوی بازار میں قابلِ بیع وشراء بھی ہوسکتے ہیں، اور اس طرح عوام کو یہ اطمینان بھی حاصل ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی لگائی ہوئی رقموں کو جب چاہیں ثانوی بازار میں فروخت کرکے واپس حاصل کرسکتے ہیں، اور اگر سرٹیفکیٹ اپنے پاس رکھنا چاہیں تو مذکورہ ادارے کی آمدنی میں حصہ دار ہوسکتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ مختلف ضروریات کے سلسلے میں مختلف طریقِ کار اختیار کئے جاسکتے ہیں، اور ان کا بہتر نظام وضع کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اندرونی قرضوں میں ایک بہت بڑی تعداد اسٹیٹ بینک کے قرضوں کی ہوتی ہے، ان پر سود کا لین دین محض ایک کتابی جمع خرچ ہے، اس کو ختم کرنے میں کوئی دشواری نہیں، اسی طرح وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان قرضوں کے لین دین میں بھی سود کی کارروائی بآسانی ختم کی جاسکتی ہے، جس میں کوئی دشواری نہیں۔

جہاں تک بیرونی قرضوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں اگر حکومت سنجیدگی کے ساتھ کوشش کرے تو دوسرے ممالک کو بھی اسلامی طریق ہائے تمویل کی بنیاد پر رقمیں فراہم کرنے پر آمادہ کرسکتی ہے۔ بیرونی قرضے دینے والوں کو اصل غرض اس بات سے ہے کہ انہیں نفع حاصل ہو، نفع حاصل کرنے کا طریقہ بذاتِ خود مقصود نہیں، اس کی ایک سادہ سی مثال یہ ہے کہ اب بھی بہت سے ممالک قرض دینے کے ساتھ ساتھ یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ سامان ہمارے ملک سے ہی خریدا جائے، جب سامان ان سے خریدنا ہی ہے تو قرض کے بجائے سامان ہی کو مرابحہ مؤجلہ کی بنیاد پر لینے میں کیا دشواری ہے؟ اور اب پوری دنیا میں اسلامی طریق ہائے تمویل رفتہ رفتہ پہچانے

جانے لگے ہیں، آئی ایم ایف (I.M.F) اور ورلڈ بینک میں ان پر باقاعدہ ریسرچ ہو رہی ہے، اور ان میں سے بعض کی تائید میں مغربی مصنفین کے مقالات بھی آ رہے ہیں۔ آئی ایف سی (I.F.C) (انٹرنیشنل فائنانس کارپوریشن) جو عالمی بینک کے طرز کا ایک اِدارہ ہے اور نجی تجارتی اِداروں کو قرضے دیتا ہے، اب اِسلامی بینکوں اور مالیاتی اِداروں سے اِسلامی طریق ہائے تمویل کی بنیاد پر اَزخود معاملات کر رہا ہے۔ ان حالات میں اگر اِسلامی ممالک سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ دُوسری حکومتوں سے اِس بنیاد پر معاملات کرنے کی کوشش کریں تو اس میں کامیابی زیادہ مشکل نہیں۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى نَبِيِّهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ

مصطلحات الکتاب

(Arabic)عربی	(English)انگلش	(Urdu)اردو
الراسمالية	Capitalism	سرمایہ دارانہ نظام
الاشتراكية	Socialism	اشتراکی نظام
الشيوعية	Communism	اشتمالیت
إقتصاد	Economics	اکنامکس
إنتاج الثروة	Production of Wealth	پیدائش دولت
توزيع الثروة	Distribution of Wealth	تقسیم دولت
مبادلة الثروة	Exchange of Wealth	مبادلہ دولت
إستهلاك الثروة	Consumption of Wealth	صرف دولت
عوامل الإنتاج	Factors of Production	پیدائش کے عوامل
نظرية عرض وطلب	Demand Supply Theory	طلب ورسد کا نظریہ
إقتصاد موجهة / اقتصاد مخطط	Planned Economy	منصوبہ بند معیشت
نظرية القدر الزائد	Theory of Surplus Value	قدر زائد کا نظریہ
ضمان	Risk	رسک (خطرہ)
دراسة الجدوى	Feasibility Report	امکاناتِ تشکیل کی رپورٹ
مذكرة	Memorandum	یادداشت
نظام الجمعية / لائحة الجمعية	Articles of Association	[illegible] ضوابط
الشخص القانونى	Legal/Juristic/Fictitious Person	شخص قانونی

نشرة الاصدار	Prospectus	پراسپکٹس
رأس المال المسموح / المصرح به	Autorised Capital	منظور کردہ سرمایہ
رأس المال المدفوع	Paid Up Capital	ادا شدہ سرمایہ
رأس المال المعروض	Issued Capital	جاری کردہ سرمایہ
رأس المال المساهم / المكتتب	Subscribed Capital	اشتراک کردہ سرمایہ
ضمان الاكتتاب	Under Writing	ضمانت مساہمہ
سهم	Share	حصہ
القيمة الاسمية	Par Value or Face Value	ظاہری قیمت
السهم المسجّل	Registered Share	رجسٹر شدہ شیئرز
السهم لحامله	Bearer Share	حامل کا حصہ
السهم العادى	Ordinary Share	عام حصہ
السهم الممتاز	Preference Share	ترجیحی حصہ
مجلس الادارة	Board of Directors	بورڈ آف ڈائریکٹرز
العضو المنتدب	Chief Executive	چیف ایگزیکٹو/ سربراہ منتظم
الجمعيّة العموميّة	Annual General Meeting	سالانہ اجتماع
إحتياطي	Reserve	محفوظ منافع
الربح	Profit	نفع
الربح الموزّع	Dividend	ڈیویڈنڈ
الشركة المحدودة	Limited Company	لمیٹڈ کمپنی
شركة عامة	Public Company	پبلک (عوامی) کمپنی
شركة خاصة	Private Company	پرائیویٹ (شخصی) کمپنی

Urdu	English	Arabic
شرکت	Partnership	شركة الأشخاص
حق حصص	Right Share	سهام الأولوية
بانڈ	Bond	سند
ڈبینچر	Debenture	شهادة الاستثمار
قابل تبدیل بانڈ	Convertible Bonds	سندات قابلة للتحويل
اثاثے / موجودات	Assets	اصول / موجودات
ذمہ داریاں	Liabilities	ديون / مطلوبات
تختۂ توازن	Balance Sheet	لائحة الرصيد
رواں اثاثے	Current Assets	موجودات متداولة
جامد اثاثے	Fixed Assets	موجودات ثابتة
غیر مادی اثاثے	Intangible Assets	موجودات غير مادية
قابل وصول اثاثے	Receivable	واجب الوصول
کتابی قیمت	Book Value	قيمة الشراء
صافی مالیت	Net Worth	المالية الصافية
نفع نقصان کا میزانیہ	Income Statement	اللائحة المالية / البيان المالي
بازار حصص	Stock Exchange	بورصة
بازار حصص سے ماوراء حصص کا کاروبار	Over the Counter Transaction	عمليات من وراء المنصة
مستقبل کے سودے	Futures Sales	مستقبليات
سٹہ / اندازہ لگانا	Speculation	تخمين
ہیجنگ	Hedging	الحماية ضد الخسارة
قیمت حصص میں اضافہ	Bull Market	الربح في قيمة الحصة
قیمت حصص میں خسارہ	Bear Market	الخسارة في قيمة الحصة

السوق المالية	Financial Market	مالیاتی بازار
بيع الخيارات	Options	آپشن اختیارات
السندات المالية الرسمية	Government Securities	سرکاری تمسکات
السوق الثانوية	Secondary Market	ثانوی بازار
خراب الذمة	Bad Debts	دین ناقابل ادا ہوجانا
ضمان الاكتتاب	Under Writing	تحریری ضمانت
دراسات	Studies	کمپنی کا جائزہ
الربح فى قيمة الحصة	Capital Gain	قیمت شیئر میں نفع
نقد	Money	زر
عملة قانونية	Legal Tender	زر قانونی
عملة قانونية محدودة	Limited Legal Tender	محدود زر قانونی
عملة قانونية غير محدودة	Unlimited Legal Tender	غیر محدود زر قانونی
مقايضة	Barter	اشیاء کے باہمی سودے
قاعدة الذهب	Gold Standard	طلائی معیار
نظام المعدنين	Bi-Metalic Standard	دودھاتی معیار
قاعدة سبائك الذهب	Gold Bullion Standard	طلاء پر مبنی معیار
نقود الثقة	Fiduciary Money	طلاء سے غیر منسلک پیسہ
النقود الرمزية	Token Money	رمزی پیسہ
كساد السوق	Market Slump/Recession	کساد بازاری
منظمة التجارة الدولية	International Trade Orgnization	بین الاقوامی تجارتی تنظیم
مذهب التجاريين	Mercantilism	مرکنٹائل ازم

الاتفاقية العامة للتصرفات الجمركية والتجارة	General Agreement on Tariff And Trade (GATT)	محصولات وتجارت کا معاہدۂ عام
صندوق النقد الدولي	International Monetary Fund	عالمی مالیاتی فنڈ
حقوق السحب	Drawing Right	قرض لینے کا حق
حقوق السحب الخاصة	(S.D.R) Special Drawing Rights	اضافی قرض لینے کا حق
البنك الدولي للانشاء والتعمير	International Bank for Reconstruction and Development	تعمیر نو اور ترقی کا عالمی بینک
نظام سعر الصرف الثابت	Fixed Exchange Rate System	طے شدہ زر مبادلہ کا نظام
أسعار الصرف العائمة الحرة	Freely Floating Exchange Rates	طلب ورسد سے منسلک بھاؤ
أسعار الصرف العائمة المدراة	Managed Float Exchange Rates	نگرانی سے منسلک بھاؤ
سلة البضائع	Basket of Goods	[illegible]ق اشیاء کا مجموعہ
تضخّم	Inflation	افراط زر
تضخّم بسبب الطلب	Demand Pull Inflation	بوجہ طلب افراط زر
تضخّم بسبب رفع الأسعار	Cost Push Inflation	بوجہ اضافہ مصارف افراط زر
إنكماش	Deflation	تفریط زر
قائمة الأسعار	Price Index	قیمتوں کا اشاریہ
وزن البضائع	Weight Commodity	اشیاء کا [illegible] وزن

المعدل الموزون	Weighted Average	وزن دار اوسط
ودائع	Deposits	امانتیں
الحساب الجاری	Current Account	مدّ رواں
حساب التوفیر	Saving Account	بچت کھاتہ
ودائع ثابتة	Fixed Deposit	مقررہ امانتیں
الارتباط بقائمة الأسعار	Indexation	انڈیکسیشن
السیولة	Liquidity	نقد پذیری
ائتمان طویل الأجل	Long Term Credit	طویل المیعاد قرضے
ائتمان قصیر الأجل	Short Term Credit	قصیر المیعاد قرضے
رأس المال العامل	Working Capital	رواں اخراجات کے قرضے
تمویل المشاریع	Project Financing	منصوبوں کے قرضے
سقف الاعتماد	Credit Ceiling	قرض دینے کی حد
احتیاطی السیولة	Liquidity Reserve	سیولت کا ریزرو
تحدید السقف	Sanction of the Limit	قرض کی حد
المصرف الزراعی	Agricultural Bank	زرعی بنک
المصرف الصناعی	Industrial Bank	صنعتی بنک
بنوک التنمیة	Development Bank	ترقیاتی بنک
المصرف التعاونی	Co-operative Bank	کوآپریٹو بنک
بنک الاستثمار	Investment Bank	انوسٹمنٹ بنک
البنک التجاری	Commercial Bank	کمرشل بنک
خطاب الضمان/خطاب الاعتماد	Letter of Credit	ضمانت نامہ
فتح الاعتماد	Opening L/C	ایل سی کھولنا

بوليصة الشحن	Bill of Lading	بل آف لیڈنگ
فتح الاعتماد بغطاء كامل	Full Margin	فل مارجن (پوری ادائیگی)
فتح الاعتماد بدون الغطاء	Zero Margin	زیرو مارجن (بغیر ادائیگی)
فتح الاعتماد ببعض الغطاء	Percentage Margin	فیصدی مارجن (کچھ ادائیگی)
تمويل الواردات	Import Financing	درآمد کے لئے قرضے
تمويل الصادرات	Export Financing	برآمد کے لئے قرضے
اعادة تمويل الصادرات	Export Refinancing	برآمد کے لئے قرض نو
كمبيالة	Bill of Exchange	ہنڈی
نضج الكمبيالة	Maturity Date	ہنڈی کی تاریخ پختگی
خصم الكمبيالة	Discounting of the Bill of Exchange	بٹہ لگانا
تظهير	Endorsement	وثیقہ کی پشت پر لکھنا
البنك الرئيسي	Central Bank	مرکزی بنک
غرفة المقاصة	Clearing House	تصفیہ گھر
سعر البنك	Bank Rate	بنک ریٹ
السعر الرسمي	Official Rat	آفیشل ریٹ
عمليات السوق المفتوحة	Open Market Operation	اوپن مارکیٹ آپریشن
اذونات الخزينة	Treasury Bill	ٹریژری بل
قيمة اسمية	Face Value	لکھی ہوئی قیمت
جمعية تعاونية	Co-operative Society	امداد باہمی سوسائٹی

❁❁❁

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴

(Quranic Studies Publishers)